بسم اللہ الرحمن الرحیم
اُدْعُوْا رَبَّکُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْیَۃً
اپنے رب کو عاجزی سے اور آہستہ پکارو
اخفاء الذکر
تالیف
شیخ الحدیث امام اہلسنت حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر مدظلہ
ناشر
مکتبہ صفدریہ
نزد گھنٹہ گھر گوجرانوالہ

اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً (قرآن کریم)
اپنے رب کو عاجزی سے اور آہستہ پکارو
خَيْرُ الذِّكْرِ الْخَفِيُّ (حدیث شریف) بہترین ذکر وہ ہے جو آہستہ ہو

؎ زنہار ازاں قوم نباشی کہ فریبند حق را بسجودے و نبی را بہ درودے (اقبالؒ)

اخفاء الذکر

جس میں کتاب حکم الذکر بالجہر پر کئے گئے قابلِ قدر اعتراضات کے مسکت جوابات دیئے گئے ہیں اور باحوالہ یہ ثابت کیا گیا کہ نمازوں کے بعد بلند آواز سے تکبیر کہنے کی بدعت ۲۱۶ھ میں خلیفہ مامون کے دور میں جاری ہوئی جو معتزلی اور رافضی تھا اور وہ حکومت کی سطح پر لوگوں کو بدعات پر مجبور کیا کرتا تھا اور صلوٰۃ التسبیح کی روایات اور اس کے راویوں کی نشاندہی بھی کی گئی ہے کہ ان کی بعض احادیث حسن بلکہ صحیح ہیں اور یہ کہ امام ابن الجوزیؒ متشدد ہیں نیز فریق مخالف کے بزرگوں اور خصوصاً ان کے اعلیٰ حضرت کے صریح فتوے اور حوالے بھی اس میں درج کر دیئے گئے ہیں جن کی رُو سے ذکر بالجہر اور اذان سے قبل اور بعد درود شریف پڑھنے کا بدعت ہونا ثابت ہے اور جب تلاوت اور ذکر بالجہر سے نمازیوں، سونے والوں اور مریضوں وغیرہم کو اذیت ہوتی ہو تو اس سے روکنا کہاں تک واجب ہے؟ ان کے علاوہ دیگر کئی اہم مسائل اور حوالے بھی اس میں درج کئے گئے ہیں۔

اِنْ اُرِيْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ وَمَا تَوْفِيْقِيْٓ اِلَّا بِاللّٰهِ

تالیف

ابوالزاہد محمد سرفراز خطیب جامع مسجد گکھڑ و صدر مدرس مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ

شائع کردہ
مکتبہ صفدریہ نزد مدرسہ نصرۃ العلوم گھنٹہ گھر گوجرانوالہ

طبع ششم/۵ ....اکتوبر ۲۰۰۹ء

نام کتاب.......... اخفاء الذکر

مؤلف..............امام اہل سنت شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر رحمہ اللہ

مطبع.......... مکی مدنی پرنٹرز لاہور

تعداد.......... گیارہ سو (۱۱۰۰)

قیمت.......... ۳۶/- (چھتیس روپے)

ناشر.......... مکتبہ صفدریہ نزد مدرسہ نصرۃ العلوم گھنٹہ گھر گوجرانوالہ

﴿ملنے کے پتے﴾

☆ مکتبہ قاسمیہ جمشید روڈ بنوری ٹاؤن کراچی
☆ کتب خانہ مظہری گلشن اقبال کراچی
☆ مکتبہ امدادیہ ملتان
☆ کتب خانہ مجیدیہ ملتان
☆ مکتبہ سید احمد شہید اردو بازار لاہور
☆ مکتبہ الاظہر بانو بازار رحیم یار خان
☆ مکتبہ الحسن حق سٹریٹ اردو بازار لاہور
☆ کتب خانہ رشیدیہ راجہ بازار راولپنڈی
☆ مکتبہ عثمانیہ میاں والی روڈ تلہ گنگ
☆ مکتبہ حلیمیہ درہ پیزو لکی مروت
☆ مکتبہ رحمانیہ قصہ خوانی پشاور
☆ مکتبہ حنفیہ فاروقیہ اردو بازار گوجرانوالہ
☆ مکتبہ سید احمد شہید اکوڑہ خٹک
☆ مکتبہ فاروقیہ ہزارہ روڈ حسن ابدال
☆ ادارۃ الانور بنوری ٹاؤن کراچی
☆ مکتبہ حقانیہ ملتان
☆ مکتبہ رحمانیہ اردو بازار لاہور
☆ مکتبہ قاسمیہ اردو بازار لاہور
☆ اقبال بک سنٹر نزد صالح مسجد صدر کراچی
☆ مکتبہ رشیدیہ سرکی روڈ کوئٹہ
☆ اسلامی کتب خانہ اڈا گامی ایبٹ آباد
☆ مکتبہ العارفی فیصل آباد
☆ مکتبہ صفدریہ چوہڑ چوک راولپنڈی
☆ والی کتاب گھر اردو بازار گوجرانوالہ
☆ ظفر اسلامی کتب خانہ گکھڑ
☆ مکتبہ علمیہ اکوڑہ خٹک
☆ ادارہ نشر واشاعت مدرسہ نصرۃ العلوم نزد گھنٹہ گھر گوجرانوالہ

فہرست مضامین

عرضِ حال

مُبَسمِلاً وَّ مُحمِّداً وَّ مُصَلِّیاً۔ اما بعد اللہ تعالیٰ کی توفیق سے راقم اثیم نے ذکر بالجہر کے مثبت اور منفی پہلو کے دونوں گوشوں کو روشن دلائل اور واضح براہین کے ساتھ حکم الذکر بالجہر میں اجاگر کیا ہے جس کو اہل علم حضرات نے بہت ہی پسند فرمایا ہے کیونکہ اس میں مختصر طریق پر بے شمار حوالوں کا تذکرہ موجود ہے اور جن بعض حضرات کو کچھ علمی شبہات تھے بحمد اللہ تعالیٰ دہ دور ہو گئے ہیں اور وہ حضرات شرح صدر کے ساتھ مطمئن ہو گئے ہیں اور یہ محض اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہے ورنہ راقم اثیم کیا اور اسکی کوئی علمی تحقیق کیا؟ سچ تو یہ ہے کہ من آنم کہ من دانم۔

جہاں اہل حق کے لئے حکم الذکر بالجہر نے تسکین کا سامان مہیا کیا وہاں اس سے شور وغل برپا کرنے والوں کے غصہ کو دوچند کر دیا اور اس سے ان کو خاصی کوفت ہوئی اور یہ ایک فطری بات ہے اور جب تک دنیا ہے یہ سلسلہ بھی جاری رہے گا۔ مؤلف ذکر بالجہر نے جن کے رد میں کتاب حکم الذکر بالجہر لکھی گئی تھی اس پر خاص واویلا مچایا ہے اور عجیب انداز میں زمین و آسمان کے قلابے ملائے ہیں اور اپنے حواریوں کو خوش اور مطمئن کرنے کے لئے بزعم خود کچھ علمی شگوفے بھی کھلائے ہیں مگر بالکل بے سود اہل علم کو تو ان سے قطعاً کوئی شبہ نہیں پڑتا اور نہ پڑ سکتا ہے البتہ بعض مبتدی طلبہ علوم کو ہو سکتا ہے کہ ان کی بزعم خویش تقریر دلپذیر سے کچھ شبہات پیدا ہوں اس لئے ہم نے بعض ایسی باتوں کا جن سے ممکن ہے کہ کسی کو شبہ پیدا ہو اس تبصرہ میں جواب عرض کر دیا ہے

اور بیچر پوچ باتوں کا ہم نے کوئی تعاقب نہیں کیا اور معجزات پر ہم نے بحمد اللہ تعالیٰ راہ ہدایت میں خاصی بحوالہ بحث کر دی گئی ہے اور غیر اللہ سے استمداد کے بارے میں گلدستہ توحید اور دل کا سرور وغیرہ میں ٹھوس علمی بحث موجود ہے اس لئے ہم نے ایسی باتوں کو یہاں بالکل نظر انداز کر دیا ہے اللہ تعالیٰ سب کو حق سمجھنے کی توفیق مرحمت فرمائے۔ آمین ثم آمین۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی رسولہ خیر خلقہ وخاتم الانبیاء محمد وعلی الہ واصحابہ ومتبعیہ وبارک وسلم۔

احقر

ابوالزاهد محمد سرفراز

باب اوّل

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ وُلْدِ
اٰدَمَ مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَاَزْوَاجِہٖ وَمَنْ تَبِعَہٗ بِاِحْسَانٍ اِلٰی یَوْمِ
الدِّیْنِ ہ اَمَّا بَعْدُ ہم نے حکم الذکر بالجہر میں صاف الفاظ میں اس کی تصریح کی تھی کہ
(۲) حضرات صوفیاء کرامؒ کے بعض سلاسل (مثلاً قادریہ اور اولیسیّہ وغیرہ) میں مبتدی کے
لئے ذکر بالجہر کا طریقہ رائج ہے اپنی شرط کے ساتھ وہ بھی صحیح ہے بنیادی شرطیں یہ ہیں
کہ جہر مفرط نہ ہو صرف تعلیم کی حد تک ہو۔ کسی نمازی۔ تلاوت کرنے والے وغیرہ کو اس
سے اذیت اور تشویش نہ ہو اگر یہ شرطیں کُلّاً یا بعضاً مفقود ہوں تو پھر اس کی اجازت
نہیں ہے اور اس زیرِ نظر کتاب میں باحوالہ اس کی بحث آ رہی ہے انشاء اللہ تعالیٰ، لہٰذا
خلط مبحث علماء اور جویانِ حق کی شان کے ہرگز مناسب نہیں ہے بلفظہٖ (حکم الذکر بالجہر ص۱۶)
اور کتاب میں اس پر متعدد صریح حوالے درج ہیں اور وہ جملہ حوالے اصل کتاب ہی میں ملاحظہ
کر لئے جائیں اور پھر آخر میں ہم نے لکھا ہے کہ انہوں (حضرات فقہاء کرامؒ) نے مسجد میں
مطلقاً ذکر بالجہر کو حرام اور مکروہ قرار دیا ہے جب کہ کوئی نماز میں مصروف ہو یا نیند میں
محو ہو ہاں اگر کسی کی نماز یا نیند وغیرہ میں کوئی خلل نہ پڑتا ہو تو اس کا معاملہ جُدا ہے،
جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے (ص۳۰۳) مگر صد افسوس کہ مؤلف ذکر بالجہر نے ہماری ان تمام

تصریحات کو شیر مادر سمجھ کر ہڑپ کر لیا ہے اور ہمارے رد میں انہوں نے جو چند اوراق سیاہ کئے ہیں ان میں عوام اور خصوصاً اپنے حواریوں کو یہ باور کرانے کی ناکام سعی کی ہے گویا کہ ہم (معاذ اللہ تعالیٰ) سرے ہی سے ذکر بالجہر کے منکر اور مخالف ہیں بلکہ اُن کے باطل نظریہ سے ہم العیاذ باللہ ذکر اور درود شریف ہی کے مُنکر ہیں اور ان کے قائل ہی نہیں ہم اس سلسلہ میں اور کچھ نہیں کہتے صرف یہ کہتے ہیں سُبْحٰنَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيمٌ

حکم الذکر بالجہر میں مذکور بیشتر دلائل اور حوالوں کو مؤلف ذکر بالجہر نے نہیں چھیڑا جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ان کے نزدیک صحیح یا لاجواب ہیں اور بعض پر گرفت کی ہے جن میں سے اہم اُمور کا ذکر کر کے ہم بحمد اللہ تعالیٰ جوابات عرض کرتے ہیں غور فرمائیں

حدیث ابن الزبیرؓ کی تحقیق

حکم الذکر بالجہر میں ہم نے مشکوٰۃ وغیرہا کے حوالہ سے حضرت عبد اللہؓ بن الزبیرؓ کی ایک مرفوع روایت (کہ نماز کے بعد بصوتہ الاعلیٰ بلند آواز سے ذکر ہوتا تھا) نقل کر کے اس کے جوابات عرض کئے ہیں اس کی پوری بحث اصل کتاب میں ملاحظہ کریں اس پر گرفت کرتے ہوئے مؤلف ذکر بالجہر نے چند باتیں لکھی ہیں جن کا سہولت کے لئے اختصاراً یوں تجزیہ کیا جا سکتا ہے۔

(۱) یہ روایت روح المعانی ج ۱۶ ص ۱۶۳ میں بھی ہے جس کو وہ قد صح سے تعبیر کر کے اس کو صحیح قرار دیتے ہیں اور یہ روایت علامہ طحطاویؒ نے بھی مسلم کے حوالہ سے نقل کی ہے (طحطاوی حاشیہ مراقی الفلاح ص ۱۸۱) اور یہ روایت تھانویؒ صاحب نے بھی امداد الفتاویٰ ج ۴ ص ۴۳ اور عثمانی صاحبؒ نے فتح الملہم ج ۲ ص ۱۷۱ میں بحوالہ صحیح مسلم نقل کی ہے اور یہ آپ کے اکابر ہیں اور علامہ طحطاویؒ زبردست فقیہ ہیں اور صاحبِ مشکوٰۃ عظیم محدث ہیں لہذا آپ کے انکار کو کون سنتا ہے (محصلہ ص ۱۱۳ و ص ۱۱۴/۱۱۸)

(۲) اس حدیث کی سند میں جو راوی ہے وہ ابراہیمؒ بن محمد الفزاریؒ ہے جو موسیٰؒ بن عقبہؒ

سے روایت کرتا ہے اور یہ صحاح ستہ کا مرکزی اور ثقہ راوی ہے مگر سرفراز صاحب نے تلبیس اور تحریف کی بدترین مثال قائم کر کے یہ راوی ابراہیم بن محمد ابو یحیٰی الاسلمی بنا لیا ہے حالانکہ موسیٰؒ بن عقبہؒ سے روایت الفزاری کی ہے نہ کہ الاسلمی کی (تہذیب التہذیب ج۱ صد ۱۵۱) (محصلہ صد ۱۱۵)

(۳) اگر یہ راوی ابراہیم بن محمد الاسلمی بھی ہو تب بھی سرفراز صاحب کو نامرادی کے سوا کچھ حاصل نہیں کیونکہ ان کو امام شافعیؒ صادق اور ثقہ فی الحدیث کہتے ہیں حمدانؒ بن اصبہانیؒ ان کی تعدیل کرتے ہیں۔ ابن عقدہؒ کہتے ہیں کہ ان کی کوئی روایت منکر نہیں ابن عدیؒ ان کو معتمد راوی قرار دیتے ہیں۔ سفیان ثوریؒ، ابن جریجؒ، ابن طہمانؒ اور حافظ ابو نعیمؒ جیسے مشہور حفاظ اور آئمہ حدیث ان سے حدیث روایت کرتے ہیں افسوس ہے کہ سرفراز صاحب نے ان حضرات کی تعدیل بالکل نقل نہیں کی (محصلہ صد ۱۲۰ و ۱۲۱) اور نیز سرفراز صاحب نے یہ غلطی کی ہے کہ وہ لکھتے ہیں کہ حضرت امام شافعیؒ کی یہ اجتہادی غلطی ہے کہ وہ ایسے راوی کو ثقہ کہتے ہیں (حکم الذکر بالجہر صد ۲۴۷) (محصلہ صد ۱۱۹) حضرت امام شافعیؒ کی اجتہادی غلطی حضرت ابن عباسؓ کی حدیث کو (جس میں نمازوں کے بعد بلند آواز سے تکبیر کہنے اور ذکر کرنے کا عہد رسالت میں ثبوت ہے) منسوخ کہنے میں ہے کیونکہ جرح و تعدیل تو امام شافعیؒ کا میدان تھا، اُس میں کیسے غلطی ہوئی غلطی تو اس میں ہے کہ انہوں نے اس کو منسوخ کہا۔ کیونکہ حدیثِ رسول کے مقابلہ میں جب وہ کوئی بات محض اپنی رائے سے کہیں گے تو اس کا کوئی وزن نہیں ہوگا۔ امام شافعیؒ تو دُور کی چیز ہیں صحابہؓ کی محض اپنی رائے سے بات بھی حضور کے مقابلہ میں معتبر نہیں (محصلہ صد ۱۲۴ و صد ۱۲۵)

(۴) اگر بصورت الاعلیٰ کی حدیث ضعیف بھی ہو تب بھی فضائل اعمال میں معتبر ہے جیسا کہ امام نوویؒ نے کتاب الاذکار صد ۷ و صد ۸ میں لکھا ہے کہ فضائل اور ترغیب و ترہیب میں ضعیف حدیث جب کہ موضوع نہ ہو قابل عمل ہے (محصلہ صد ۱۲۱)، جیسا کہ

صلوٰۃ التسبیح کی حدیث کو ابن جوزیؒ نے کتاب الموضوعات میں درج کیا ہے۔ الآثار المرفوعۃ ص۱۲۲ المولانا عبدالحیؒ حالانکہ آئمہ فتوٰی کے نزدیک صلوٰۃ التسبیح مستحب ہے۔ اور بیس۲۰ رکعت نماز تراویح بتصریح فقہاء سنت مؤکدہ ہے حالانکہ اس کی سند میں ابراہیم بن عثمان ہے جو بالاتفاق ضعیف ہے شعبہؒ نے کہا کہ وہ جھوٹا ہے ابن معینؒ ان کو غیر ثقہ اور امام احمدؒ بن حنبلؒ اس کو ضعیف کہتے ہیں (الحاوی للفتاوی ج۱ ص۳۴۷) اسی طرح ترمذیؒ، ابوداؤدؒ، نسائی اور دارقطنیؒ و جوزجانیؒ نے اس پر سخت جرح کی ہے (محصلہ تہذیب ج۱ ص۱۴۴ و ص۱۴۵) آئمہ اربعہؒ اور اصحاب ظواہر کے نزدیک میت کے ترکہ سے پہلے قرض پھر وصیت ادا کی جائے گی۔ حالانکہ اس کے بارے میں جو حدیث ترمذی ص۳۰۹ میں آتی ہے وہ سخت ضعیف ہے اس میں حارث اعور راوی ہے جو غایت درجہ کا ضعیف ہے علیؒ بن المدینیؒ نے کہا ہے کہ وہ کذاب ہے الخ (تہذیب ج۲ ص۱۴۶) (محصلہ ص۱۲۲ و ص۱۲۳ ذکرہ بالجہر)

⑤ سرفراز صاحب لکھتے ہیں کہ اگر اس روایت کو صحیح بھی تسلیم کر لیا جائے تو وہی جواب ہے جو امام شافعیؒ نے دیا ہے کہ یہ تعلیم کے لئے تھا نہ کہ اس پر مداومت فرمائی لیکن امام شافعیؒ کی محض رائے سے حدیث پر کوئی زد نہیں پڑتی (محصلہ ص۱۲۴)

الجواب: ہم بعون اللہ تعالیٰ ترتیب وار ہر ایک شق کا جواب عرض کرتے ہیں غور سے ملاحظہ فرمائیں۔

① علامہ آلوسیؒ حدیث کی کسی کتاب کا حوالہ دیئے بغیر ہی وصح عن ابی الزبیر الخ نقل کرتے ہیں بظاہر انہوں نے مسلم کی طرف مراجعت نہیں کی ورنہ بخوبی دیکھ لیتے کہ اس میں بصوتہ الاعلیٰ کے الفاظ موجود ہی نہیں ہیں غالباً انہوں نے کتاب الام اور مشکوٰۃ وغیرہ کی روایت سے مغالطہ کھایا ہے اور سند کی طرف بالکل مراجعت نہیں کی ورنہ مغالطہ بالکل واضح ہو جاتا اور علامہ آلوسی کی عبارت میں وصح کے الفاظ ہیں۔

وفتد صحیح نہیں جیسا کہ مؤلف مذکور نے ذکر بالجہر ص۱۱۸ میں ان سے نقل کئے ہیں اور علامہ آلوسیؒ نے اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد اس کا جو محمل بیان کیا ہے مؤلف مذکور اس کو بھی گیارہویں شریف کا میٹھا دودھ سمجھ کر پی گئے ہیں علامہ آلوسیؒ اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں۔

وهو محمول على اقتضاء حاجة التعليم ونحو ذالك (روح المعانی ج۱۶ ص۱۶۳) — اور یہ اس بات پر محمول ہے کہ تعلیم وغیرہ کی حاجت اس کو چاہتی تھی۔

اس سے معلوم ہوا کہ یہ حدیث علامہ آلوسیؒ کے نزدیک بھی تعلیم پر محمول ہے نہ یہ کہ مطلقاً ذکر بالجہر اس سے ثابت ہے اور علامہ عثمانیؒ نے مشکوٰۃ ہی کے حوالہ سے مسلم کا ذکر کیا ہے (ملاحظہ ہو فتح الملہم ج۲ ص۱۷۱) اور فتح الملہم ج۲ ص۱۷۱ میں جب مسلم کی اس حدیث کو نقل کر کے اس کی تشریح کی ہے تو اس میں بصوته الاعلى کا جملہ مذکور نہیں اور شرح میں اس کی طرف اشارہ تک نہیں کیا علامہ طحطاویؒ نے ضرور مسلم کا نام لیا ہے لیکن ایسا لگتا ہے کہ انہوں نے بھی مشکوٰۃ وغیرہا پر ہی اعتماد کیا ہے مسلم کی طرف رجوع نہیں کیا ورنہ ان جیسے ذکی اور فہیم عالم پر حقیقت بالکل عیاں ہو جاتی اور اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد وہ تحریر فرماتے ہیں کہ :-

ويستفاد من الحديث الاخير جواز رفع الصوت بالذكر والتكبير عقب المكتوبات بل من السلف من قال باستحبابه وجزم به ابن حزم من المتأخرين (طحطاوی ص۱۷۱) — اور اس آخری (مسلم کی) حدیث سے فرضی نمازوں کے بعد بلند آواز سے ذکر کرنا اور تکبیر کہنا مستفاد ہوتا ہے بلکہ سلف میں سے بعض اس کے استحباب کے قائل تھے اور متاخرین میں سے ابن حزمؒ نے اسی کا جزم کیا ہے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ جب مسلم کی روایت میں سرے سے بصوته الاعلى کے الفاظ ہی موجود نہیں ہیں اور یہ استدلال اسی پر موقوف ہے تو پھر اس حدیث سے

بلند آواز کے ساتھ ذکر اور تکبیر کا استفادہ کیسے ہوا؟ یہ روایت مسند احمد ج ۴ ص۵ و ابو داؤد ج ۱ ص۲۱۱ اور نسائی ج ۱ ص۱۵۱ میں بھی ہے مگر بصوتہ الاعلیٰ کے الفاظ ان میں بھی موجود نہیں ہیں اور امام بیہقی نے سنن الکبریٰ ج ۲ ص۱۸۵ میں اور علامہ مجدالدین ابن تیمیہؒ نے منتقی الاخبار مع النیل ج ص۳۱۶ میں اور امام ابن قدامہؒ نے مغنی ج ۱ ص۵۵۹ میں اور امام نوویؒ نے ریاض الصالحین ص۵۶ میں مسلم وغیرہ کے حوالہ سے یہ نقل کی ہے مگر کسی نے بصوتہ الاعلیٰ کے الفاظ نقل نہیں کئے۔

حضرات آئمہ اربعہؒ اور دیگر جمہور سلف تو نمازوں کے بعد بلند آواز سے تکبیر اور ذکر کے قائل نہ تھے البتہ علامہ ابن حزم ظاہریؒ اپنی ظاہریت کی بناء پر جمہور کے مخالف تھے مگر ان کی مخالفت اجماع پر قطعاً اثر انداز نہیں ہوتی اور حضرات سلفؒ میں بعض حضرات وقت کے ظالم حاکموں کے مجبور کرنے سے دفع شر کے لئے بلند آواز سے پڑھتے تھے مگر یہ جواز کی دلیل نہیں بن سکتی۔ حافظ ابن کثیرؒ کی مشہور تاریخی کتاب البدایہ والنہایہ کا حوالہ عرض کیا جا چکا ہے کہ خلیفہ مامون رافضی اور معتزلی نے نمازوں کے بعد بلند آواز سے ذکر کی بدعت نکالی اور چونکہ وہ خلیفہ وقت تھا وہ اس کاروائی پر لوگوں کو مجبور کرتا تھا غرضیکہ بصوتہ الاعلیٰ کے الفاظ مسلم کے حوالہ سے نقل کرنا صاحب مشکوٰۃ وغیرہ کا وہم ہے اور راقم اثیم کی یہ بات بالکل صحیح ہے کہ یہ ان کا وہم ہے جیسا کہ مشکوٰۃ میں ان کے اور کئی اوہام ہیں اور کسی بھی ذی شعور عالم سے ان کے اوہام مخفی نہیں ہیں اور بے شک وہ بڑے عظیم محدث ہیں مگر وہم سے کون بچ سکا ہے۔ الا عصمہ اللہ تعالیٰ اور کتاب الام وغیرہ میں بصوتہ الاعلیٰ کے الفاظ موجود ہیں لیکن سند میں ابراہیم بن محمد ابن ابی یحییٰ ہے جس پر مفصل جرح حکم الذکر بالجہر میں مذکور ہے۔

(۲) راوی کی تعیین کے لئے اصولی طور پر دو چیزیں ضروری ہوتی ہیں ایک یہ کہ اس کا استاد کون ہے اور دوسری یہ کہ اس کے شاگرد کون کون ہیں؟ بحمد اللہ تعالیٰ ہم نے

حکم الذکر بالجہر میں جو کچھ لکھا ہے وہ اصول کے عین مطابق ہے اور مؤلف مذکور نے تعصبِ مذہبی کے بے لگام گھوڑے پر سوار ہو کر محض تُک بندی سے کام لیا ہے انہوں نے صرف یہ حوالہ دیکھ کر پلے باندھ لیا ہے کہ اس سند میں موسیٰ بن عقبہؒ ہیں اور ان کے شاگردوں میں ابو اسحاق ابراہیمؒ بن محمد الفزاریؒ ہیں اور وہ ثقہ ہیں لہذا یہ ابراہیم بن محمد بن ابی یحییٰ نہیں ہو سکتے اور لکھتے ہیں کہ حکم الذکر بالجہر کے مصنف نے تلبیس و تحریف سے کام لیا ہے مگر ایسا ہرگز نہیں ہوا بلکہ خود مؤلف مذکور نے کتب اسماء الرجال کی واضح تصریحات کو نظر انداز کر دیا ہے جو درج ذیل ہیں۔

۱۔ تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۱۵۸ میں تصریح موجود ہے کہ ابراہیم بن محمد بن ابی یحییٰ الاسلمی کے شاگردوں میں امام شافعیؒ بھی ہیں اور الفزاری کے شاگردوں میں امام شافعیؒ کا نام مذکور نہیں ہے۔

۲۔ تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۲۵ حضرت امام شافعیؒ کے ترجمہ میں تصریح موجود ہے کہ امام شافعیؒ کے استادوں میں ابراہیم بن محمد بن ابی یحییٰ ہیں اور کتب اسماء الرجال میں ایسی کوئی تصریح موجود نہیں کہ امام شافعیؒ کے استادوں میں ابراہیمؒ بن محمد الفزاریؒ بھی ہیں اور نہ ابراہیمؒ بن محمد الفزاریؒ کے شاگردوں میں صراحتہً اس کا ذکر ہے کہ امام شافعیؒ بھی ان کے شاگرد ہیں ومن ادعیٰ ذٰلك فعلیہ البیان بالبرھان

۳۔ ابراہیمؒ بن محمد الفزاریؒ بلا اختلاف ثقہ راوی ہیں اگر ان سے امام شافعیؒ کی روایت ہوتی تو اس میں حضرات محدثین کی ناگواری حیرت اور تعجب کی کیا بات ہے؟ مگر ابراہیمؒ بن ابی یحییٰؒ انتہائی کمزور بلکہ کذاب راوی ہے اسی لئے امام شافعیؒ کی اس سے روایت کرنے پر محدثین کرامؒ کو تعجب بھی ہے اور حیرت بھی چنانچہ امام اسحاقؒ بن راہویہؒ فرماتے ہیں کہ میں نے ابراہیم بن ابی یحییٰ سے کسی کو احتجاج کرتے نہیں دیکھا جیسا کہ امام شافعیؒ کرتے ہیں اور خود تصریح فرماتے ہیں کہ

قلت للشافعیؒ وفی الدنیا احد یحتج بابراهیم بن ابی یحییٰؒ (تہذیب التہذیب ص۱۶۱) میں نے امام شافعیؒ سے سوال کیا کہ کیا دنیا میں کوئی ابراہیم بن ابی یحییٰ سے بھی احتجاج کرتا ہے؟

ملاحظہ کیجئے کہ امام اسحاق بن راہویہؒ جوٹی کے فقیہ اور محدث ہیں لیکن امام شافعیؒ کے ابراہیم بن ابی یحییٰ سے احتجاج کرنے پر حیرت محسوس کرتے ہیں اور متعجب ہیں جیسا کہ ان کے الفاظ سے بالکل ظاہر ہے۔

۴۔ امام شافعیؒ کے آخری شاگرد امام ربیعؒ سے سوال کیا گیا کہ امام شافعیؒ کو کس چیز نے آمادہ کیا کہ انہوں نے ابراہیم بن ابی یحییٰ سے روایت کی تو انہوں نے جواب میں ارشاد فرمایا کہ امام شافعیؒ فرماتے تھے کہ ابراہیم کسی بلندی سے گر جاتے تو ان کو یہ اس سے زیادہ پسند تھا کہ وہ جھوٹ بولتے اور وہ فرماتے تھے کہ ابراہیم بن ابی یحییٰ ثقہ تھے (تہذیب التہذیب ج۱ ص۱۵۹ و میزان الاعتدال ج۱ ص۵۸)

۵۔ تہذیب التہذیب ج۱ ص۱۶۱ میں ہے کہ امام شافعیؒ نے اپنی کتاب اختلاف الحدیث میں ابراہیم بن ابی یحییٰ کو دراوردیؒ سے احفظ کہا ہے اور یہ حوالہ اختلاف الحدیث علیٰ ہامش کتاب الام ج ۷ ص۲۹۴ میں موجود ہے۔

۶۔ ناقدِ فنِ رجال علامہ ذہبیؒ تذکرۃ الحفاظ ج۱ ص۳۲۹ میں حضرت امام شافعیؒ کے ترجمہ میں ان کے استادوں میں ابراہیم بن ابی یحییٰ کا نام بھی ذکر کرتے ہیں، اگر الفزاریؒ بھی ان کے استاد ہوتے تو ایسی ثقہ اور جلیل القدر ہستی کو نظر انداز کرنے کے کیا معنی؟ کیونکہ کتب اسماء الرجال میں اکثر مشہور استادوں اور شاگردوں کا ذکر کیا جاتا ہے امام خطیب بغدادیؒ نے بھی امام شافعیؒ کے استادوں میں ابراہیم بن ابی یحییٰ کا نام بیان کیا ہے نہ کہ الفزاریؒ کا (تاریخ بغداد ج ۲ ص۵۶)

۷۔ حضرت امام شافعیؒ کی صراحت کے ساتھ ابراہیم بن ابی یحییٰ سے روایتیں موجود ہیں مثلاً مسند شافعی ص۲۱ میں ہے اخبرنا ابراهیم بن ابی یحییٰ الخ اور نیز ص۱۱۲ وغیرہ اور یہی ابراہیم بن محمد بن ابی یحییٰ ہیں جن سے مسند شافعی ص۵، ص۹، ص۱۱، ص۱۳

ص۱۴، ۱۵، ۲۰، ۲۱، ۲۲، ۲۳، ۲۴، ۲۵، ۲۶، ۲۷، ص۱۱۵، ص۱۱۸، ص۱۱۹ وغیرہ میں روایتیں موجود ہیں۔ اور کتاب اختلاف الحدیث ص۵۵، ۶۶، ۷۰، ۸۹، ۹۶، ۲۳۰، ص۲۹۴، ۲۶ ، ۳۴ اور ص۴۰۵ وغیرہ میں بھی موجود ہیں اور اسی طرح کتاب الام میں بےشمار روایات موجود ہیں جو شمار سے باہر ہیں۔

۸۔ امام ربیع بن سلیمان رح فرماتے ہیں کہ

كان الشافعي رضي الله تعالىٰ عنه اذا قال اخبرني من لا اتهم يريد به ابراهيم بن ابي يحيى الخ (مسند شافعي ص۲۸ وميزان الاعتدال ج۱ ص۵۸)

امام شافعی رح جب یہ فرماتے ہیں کہ مجھ سے اس نے بیان کیا جس کو میں متہم (بالکذب) نہیں سمجھتا تو اس سے اُن کی مُراد ابراہیم بن ابی یحیی ہوتے ہیں۔

اور امام الحافظ ابو حاتم رح فرماتے ہیں کہ جب امام شافعی رح یہ فرماتے ہیں۔ اخبرنی الثقۃ عن مولی التوأمۃ تو اس سے وہ ابراہیم بن ابی یحیی مراد لیتے ہیں اور جب یہ فرماتے ہیں اخبرنی من لا اتہم تو اس سے بھی وہ ابراہیم بن ابی یحیی مراد مراد لیتے ہیں (حاشیہ کتاب الام ج۱ ص۲۵۲) اور کتاب الام ج۱ ص۲۰۵ ص۲۵۳ و ص۲۵۴ میں (آٹھ روایتیں) اور ص۲۷۳ وغیرہ میں اخبرنی من اتہمہ کے طریق سے متعدد روایتیں موجود ہیں اور اسی طرح مسند شافعی ص۲۸ میں اخبرنی من لا اتہم کے طریق سے تین روایتیں اور ص۲۹ میں اخبرنا من لا اتہم کے طریق سے دس روایات موجود ہیں الغرض حضرت امام شافعی رح نے ان سے اس کثرت سے روایات لی ہیں کہ کوئی حد نہیں اور یہی وجہ ہے کہ آئمہ جرح و تعدیل امام شافعی رح کا بڑا شکوہ کرتے ہیں کہ انہوں نے اس سے روایتیں کیوں لی ہیں؟ اور پھر اس کثرت سے؟

۹۔ امام ابن حبان رح نے حضرت امام شافعی رح کی ابراہیم بن ابی یحیی رح سے روایت کرنے کی یہ توجیہہ بیان کی ہے۔

واما الشافعی فانہ کان یجالس ابراهیم فی حداثتہ و یحفظ عنہ فلما دخل مصر فی اخر عمرہ واخذ یصنف الکتب احتاج الی الاخبار ولم یکن کتبہ معہ فاکثر ما اودع الکتب من حفظہ وربما کنی عن اسمہ الخ (تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۱۶۱)	کہ امام شافعیؒ اپنی جوانی کے زمانہ میں ابراہیم کے پاس بیٹھتے تھے اور ان سے حدیثیں یاد کرتے تھے جب امام شافعیؒ آخر عمر میں مصر میں داخل ہوئے اور کتابوں کی تصنیف شروع کی اور ان کو حدیثوں کی ضرورت پڑی اور ان کے پاس کتابیں نہ تھیں تو کتابوں میں اکثر اپنے حافظہ سے روایتیں درج کیں اور بعض اوقات ابراہیم کے نام کی بجائے انہیں رمز سے بیان کرتے تھے۔

(مثلاً اخبرنی الثقۃ یا اخبرنی من لا اتھم)

۱۰۔ طبقہ کے لحاظ سے اگرچہ ابراہیم بن ابی یحییٰ اور الفزاری ایک طبقہ کے لوگ ہیں لیکن براہِ راست امام شافعیؒ کی روایت الفزاریؒ سے ثابت نہیں ہے صرف اس قدر ثابت ہے کہ امام شافعیؒ نے الفزاریؒ کی کتاب دیکھی ہے اور اس کو پسند بھی کیا ہے، چنانچہ امام خلیلیؒ فرماتے ہیں کہ

ابو اسحاق امام یقتدی بہ وھو صاحب کتاب السیر نظر فیہ الشافعی واملی کتابا علی ترتیبہ و رضیہ وقال الحمیدی قال لی الشافعی لم یصنف احد فی السیر مثلہ (تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۱۵۲)	ابو اسحاقؒ مقتدا امام ہیں اور انہوں نے کتاب السیر لکھی ہے اس کتاب کو امام شافعیؒ نے دیکھا ہے اور اس کو پسند بھی کیا ہے اور اپنی کتاب ان کی کتاب کی ترتیب پر لکھی ہے امام حمیدیؒ فرماتے ہیں کہ مجھ سے امام شافعیؒ نے فرمایا کہ سیرت میں الفزاریؒ کی کتاب جیسی اور کوئی کتاب تصنیف نہیں ہوئی۔

یہ عبارت اس بات کو بالکل عیاں کرتی ہے کہ باوجود امکانِ لقاء کے حضرت امام شافعیؒ کی براہِ راست الفزاریؒ سے روایت نہیں ہے بلکہ انہوں نے ان کی صرف کتاب ہی دیکھی ہے اور اس کو پسند بھی کیا ہے۔ اور اپنی کتاب ان کی کتاب کی ترتیب پر

لکھی ہے لہذا موسیٰؒ بن عقبہؒ کے شاگردوں میں الغزاریؒ کے تذکرہ سے بہرگز ثابت نہیں ہوتا کہ امام شافعیؒ کے استاد الفزاریؒ ہیں اور الاسلمی نہیں جیسا مؤلف مذکور کو دھوکہ ہوا ہے اور جہل مرکب کا شکار ہو کر اپنی لیاقت پر پھولے نہیں سماتے اور الٹا راقم اثیم کو کوستے ہیں اور خود غیر سے علم اور علمی اصطلاحات سے بالکل کورے اور بے بہرہ ہیں راقم اثیم اگرچہ خود تو کچھ نہیں مگر بحمد اللہ تعالیٰ راقم اثیم کو کامل اور فنی استادوں کی علمی صحبت سے فن رجال میں بھی کچھ شد بد ہے یہ الگ بات ہے کہ بقول شخصے ع

خود ہی بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں

الغرض اندرونی اور بیرونی ٹھوس حوالوں سے یہ ثابت ہے کہ امام شافعیؒ کا استاد اس سند میں ابراہیم بن ابی یحییٰ ہی ہے نہ کہ الفزاریؒ اور ابراہیم بن ابی یحییٰ حسب تصریح آئمہ جرح وتعدیل کذاب ہے جو جعلی حدیثیں بھی بنایا کرتا تھا اور رافضی اور معتزلی بھی ہے (ملاحظہ ہو تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۱۵۸) اور نمازوں کے بعد ذکر بالجہر کی بدعت ہی ۲۱۶ھ میں مامون معتزلی اور رافضی نے ایجاد کی ہے جس کا ذکر البدایہ والنہایہ کے حوالہ سے عرض کیا گیا ہے۔

(۳) ہم نے حکم الذکر بالجہر میں تصریح کی ہے اور خود مؤلف مذکور نے ذکر بالجہر ص ۱۱۹ میں اس کو نقل کیا ہے کہ حضرت امام شافعی اس کو ثقہ کہتے ہیں اور کتب رجال میں ابن عقدہؒ اور ابن عدیؒ کی توثیق بھی منقول ہے اور علامہ ذہبیؒ فرماتے ہیں۔

وقد وثقہ الشافعیؒ وابن الاصبھانیؒ	کہ امام شافعیؒ اور ابن الاصبہانیؒ نے اس کی
قلت الجرح مقدم اھ	توثیق کی ہے اور میں کہتا ہوں کہ جرح مقدم ہے

(میزان الاعتدال ج ۱ ص ۵۹)

جرح اس لئے مقدم ہے کہ کذاب وغیرہ کے سنگین الفاظ سے ان پر جرح ہے جو جرح مفسر ہے اور جرح کرنے والے آئمہ جرح وتعدیل ہیں مثلاً امام یحییٰؒ بن سعید۔ امام

یحیٰیؒ بن معینؒ اور امام علیؒ بن المدینیؒ وغیرہ بہ سب اس کو کذاب کہتے ہیں اور ان کے مفصل اقوال باحوالہ حکم الذکر بالجہر میں درج ہیں جنہوں نے مؤلف مذکور کو حیرت زدہ اور بے بس بنا کر دیا ہے کہ ۔ ع

نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن

چونکہ اس کے کذاب وضاع متروک الحدیث اور رافضی وغیرہ ہونے کے واضح اور صریح حوالے آئمہ جرح وتعدیل سے باحوالہ نقل کئے گئے ہیں اس لئے حمدانؒ ابن عقدہؒ اور ابن عدیؒ وغیرہ کے حوالے ہم نے نقل نہیں کئے کیونکہ ان میں سے کوئی بھی سابق ذکر کردہ آئمہ جرح وتعدیل کے ہم پلّہ نہیں بلکہ بہ سب مل کر بھی امام یحیٰیؒ بن سعیدؒ، امام یحیٰیؒ بن معینؒ اور امام علیؒ بن المدینی رح وغیرہ میں سے کسی ایک کے ہم پایہ بھی نہیں ہو سکتے، اس لئے ان کے اقوال کو درخور اغتنا نہیں سمجھا گیا اور یہ بھی ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ کسی راوی سے کسی محدث کا روایت کرنا اس کی توثیق کی دلیل نہیں کیونکہ بڑے بڑے کذاب اور دجال راوی بھی ہوتے ہیں جن سے بعض محدثین کرامؒ نے روایتیں کی ہیں اور کتب اسماء الرجال میں اس کی بے شمار نظیریں موجود ہیں لہذا ابن طہمانؒ اور سفیان ثوریؒ وغیرہ کا اس سے روایت کرنا اس کی ثقاہت کی ہرگز دلیل نہیں چونکہ حضرت امام شافعی رح کا اصل میدان فقہ ہے اس لئے ان کا حضرت ابن عباسؓ کی حدیث کو منسوخ کہنا بالکل صحیح ہے کیونکہ یہ ان کا اپنا میدان ہے اور ابراہیمؒ بن ابی یحیٰی رح کو ثقہ کہنا یقیناً ان کی غلطی ہے جو آئمہ جرح وتعدیل کے روشن حوالوں سے ثابت ہے جیسا کہ حکم الذکر بالجہر میں تفصیلاً مذکور ہیں ۔

امام شافعیؒ کی محض رائے نہیں

مؤلف مذکور نے اپنی لاعلمی کی وجہ سے اس پر خاصا زور صرف کیا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ کی روایت کو منسوخ کہنا امام شافعیؒ کی غلطی ہے حالانکہ مؤلف مذکور کا یہ نظریہ قطعاً

باطل ہے اس لئے کہ حضرت امام شافعیؒ کے پیش نظر قرآن کریم کی نص قطعی اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّ خُفْيَةً الآیۃ اور وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ الآیۃ اور صحیح حدیث اربعوا علیٰ انفسکم الحدیث اور حدیث خیر الذکر الخفی وغیرہ دلائل ہیں لہذا ان پر یہ الزام کہ انہوں نے محض اپنی رائے سے اس حدیث کو منسوخ کہا ہے سراسر باطل ہے وہ بالاتفاق مجتہد مطلق ہیں اور تقدم و تاخر اور ناسخ و منسوخ کو بخوبی جانتے ہیں اور صحیح حدیث کو محض اپنی رائے سے منسوخ قرار دینے کی جرأت کبھی نہیں کر سکتے اور نہ ایسا کرنے سے وہ عادل رہتے ہیں اور وہ خود روایات کا حوالہ دیتے ہیں چنانچہ وہ خود تحریر فرماتے ہیں

وماروی عن ابن عباسؓ من تکبیرہ کما رویناہ قال الشافعیؒ واحسبہ انما جہر قلیلا لیتعلم الناس منہ ذلک لان عامۃ الروایات التی کتبناھا مع ھذا او غیرھا لیس یذکر فیھا بعد التسلیم تھلیل ولا تکبیر اھ (کتاب الام ج۱ ص۱۲۷)

کہ حضرت ابن عباسؓ نے جو (بلند آواز سے) تکبیر بروایت کی ہے جیسا کہ ہم نے ان کی روایت نقل کی ہے میرا خیال ہے کہ آپؓ نے کچھ عرصہ جہر کیا تاکہ لوگوں کو تعلیم ہو جائے کیونکہ اکثر روایات جو ہم نے اس حدیث کے ساتھ یا ان کے علاوہ لکھی ہیں ان میں سلام کے بعد نہ تو لا الٰہ الا اللہ کا ذکر ہے اور نہ اللہ اکبر کہنے کا۔

اس سے صاف طور پر واضح ہو گیا کہ امام شافعیؒ اپنی اجتہادی رائے پر عامۃ الروایات یعنی اکثر روایات سے استدلال کر رہے ہیں محض رائے پر ہی اعتماد نہیں کرتے لہذا اس کو امام شافعیؒ کی محض رائے کہہ اور بتا کر اس کو رد کر دینا علم و انصاف کا خون کرنا ہے اور حضرت ابن عباسؓ کی اس روایت کو منسوخ قرار دینے میں محض امام شافعیؒ ہی منفرد نہیں بلکہ دیگر ائمہ متبوعین بھی ان کے ساتھ ہیں اور نمازوں کے بعد بلند آواز سے ذکر کرنے اور تکبیر کہنے کے بدعت ہونے میں وہ بھی متفق ہیں حضرت امام ابوحنیفہؒ کا مسلک بلند آواز سے ذکر اور دعا کرنے کے بدعت و مکروہ ہونے کا ہم نے بفضلہ تعالیٰ حکم الذکر بالجہر میں فقہاء احنافؒ کے جم غفیر سے ٹھوس اور واضح حوالوں سے نقل کر دیا ہے جن کی تیز روشنی نے مؤلف مذکور

کی آنکھوں کو خیرہ اور اندھا کر دیا ہے اور ان حوالوں سے وہ بد حواس ہو کر حیرت کا شکار ہیں جیسا کہ ان کی نامعقول تحریر سے بالکل عیاں ہے اور وہ ان حوالوں کے بوجھ کے نیچے ایسے دبے ہیں کہ انشاء اللہ تعالیٰ بمع اپنی پوری جماعت کے قیامت تک نہیں نکل سکتے اور حضرت امام مالک رح بھی نمازوں کے بعد بلند آواز سے تکبیر کہنا محدث اور بدعت قرار دیتے ہیں چنانچہ علامہ عینی رح تحریر فرماتے ہیں کہ

وروی ابن القاسم عن مالک انہ محدث وعن عبیدۃ انہ بدعۃ۔ (عمدۃ القاری ج ۶ ص ۱۲۶ و فتح الملہم ج ۲ ص ۱۷۱)

امام ابن القاسم رح امام مالک رح سے روایت کرتے ہیں کہ یہ محدث ہے اور عبیدہ رح کی روایت میں ہے کہ یہ بدعت ہے

اور حافظ ابن حجر رح بھی امام مالک رح سے محدث کے الفاظ نقل کرتے ہیں۔
(فتح الباری ج ۲ ص ۴۶۹)

امام نووی رح اور علامہ عینی رح وغیرہ محدث بطال رح کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ مذاہب متبوعہ وغیرہم کے بزرگ اس بات پر متفق ہیں کہ بلند آواز سے ذکر مستحب نہیں ہے۔ (ملاحظہ ہو نووی شرح مسلم ج ۱ ص ۲۱۷ و عمدۃ القاری ج ۶ ص ۱۲۶) اور ان اصحاب متبوعہ میں حضرت امام احمد بن حنبل رح بھی ہیں اور حافظ ابن کثیر رح المذاہب الاربعہ کے الفاظ نقل کرتے ہیں (البدایۃ والنہایہ ج ۱۰ ص ۲۷)

الغرض یہ بات بالکل واضح ہے کہ نمازوں کے بعد بلند آواز سے تکبیر کہنے اور ذکر کرنے کے صرف حضرت امام شافعی رح ہی مخالف نہیں بلکہ باقی حضرات آئمہ مجتہدین وغیرہم بھی ان کے ساتھ ہیں اس لئے حضرت امام شافعی رح کا یہ فیصلہ کہ حضرت ابن عباس رض کی روایت منسوخ ہے اور جہر صرف تعلیم کی خاطر کچھ عرصہ ہوا بالکل درست اور صحیح ہے اور یہ محض ان کی رائے نہیں بلکہ ان کی رائے روایات پر مبنی ہے اور جمہور آئمہ کی تائید بھی انہیں حاصل ہے لہٰذا اس کو رد کرنا اجماع کو رد کرنا ہے اور اجماع ادلۂ شرع میں ایک وزنی دلیل

ہے اور المدخل ج ۱ ص۱۰۹ کے حوالہ سے حکم الذکر بالجہر میں بالاجماع کے الفاظ بھی ہم نے ذکر کئے ہیں چونکہ محدث ابن بطال رحؒ کے اس قول کو فقہاء کرامؒ میں سے کسی نے رد نہیں کیا بلکہ تائید ہی کی ہے لہذا اس کو نظر انداز کرنا غلط ہے جیسا کہ مؤلف مذکور نے جان چھڑانے کے لئے کیا ہے (ملاحظہ ہو ذکر بالجہر ص۱۰۸، ۱۰۹) باقی بحث اور حوالے اس حدیث کے بارے میں اصل کتاب حکم الذکر بالجہر میں ملاحظہ فرمائیں۔

(۴) بلاشک ضعیف حدیث فضائل اعمال میں حضرات محدثین کرامؒ کے نزدیک قابلِ عمل ہوتی ہے لیکن اس کے لئے یہ شرط ہے کہ موضوع نہ ہو (ملاحظہ ہو توجیہ النظر ص۲۹۷ وغیرہ) اور خود مؤلف مذکور نے امام نوویؒ کی کتاب الاذکار سے موضوع نہ ہونے کی شرط نقل کی ہے اور علامہ السخاویؒ ضعیف حدیث کے قابلِ عمل ہونے کے لئے چند شرائط نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ

الاول متفق علیہ ان یکون الضعف غیر شدید فیخرج من انفرد من الکذابین والمتھمین بالکذب ومن فحش غلطہ (القول البدیع ص۱۹۵)	پہلی شرط جس پر تمام محدثین کا اتفاق ہے یہ ہے کہ ضعف سخت نہ ہو اس شرط سے وہ حدیث خارج ہو جائے گی جس میں کذاب اور متہم بالکذب اور زیادہ غلطیاں کرنے والا راوی منفرد ہو۔

مطلب بالکل واضح ہے کہ جس روایت میں کذاب راوی ہو وہ کسی طرح بھی قابلِ عمل نہیں ہے اور ابراہیم بن محمد بن ابی یحییٰ کا کذاب ہونا آئمہ جرح و تعدیل کے ٹھوس حوالوں سے حکم الذکر بالجہر میں نقل کیا جا چکا ہے اور حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ اگر کسی راوی پر کذب کی وجہ سے طعن ہو تو اس کی حدیث موضوع ہوتی ہے (شرح نخبۃ الفکر ص۵۱) اور موضوع حدیث ضعیف کی بدترین قسم ہے اور اس کو کسی بھی مقصد کے لئے بیان کرنا جائز نہیں چنانچہ امام نوویؒ اور علامہ سیوطیؒ لکھتے ہیں کہ

الموضوع ھو الکذب المختلق المصنوع و	موضوع وہ روایت ہے جو گھڑی ہوئی ہو اور وہ

ھو شر الضعیف واقبحہ وتحرم روایتہ مع العلم بہ ای بوضعہ فی ای معنی کان سواء الاحکام والقصص والترغیب وغیرھا الا مبینًا ای مقرونا ببیان وضعہ (تدریب الراوی مع التقریب ص۱۷۸)	ضعیف حدیث کی بدترین قسم ہے اور یہ جانتے کہ یہ روایت موضوع ہے اس کا بیان کرنا حرام ہے جس مقصد کے لئے بھی ہو عام اس سے کہ احکام اور قصص میں ہو یا ترغیب (وترہیب وغیرہ) میں ہاں مگر اس بیان کے ساتھ کہ یہ جعلی حدیث ہے (تاکہ کسی کو شبہ اور مغالطہ نہ رہے)

الغرض ابراہیم بن محمد بن ابی یحییٰ جیسے کذاب کی روایت کو فضائل او ترغیب وغیرہ میں پیش کرنا بھی حرام ہے۔

صلوٰۃ التسبیح آلآثار المرفوعہ سے بحوالہ ابن الجوزیؒ مؤلف مذکور نے صلوٰۃ التسبیح کا موضوع ہونا نقل کیا ہے حالانکہ وہ مستحب ہے تو اس میں تفصیل ہے

اولًا۔ یہ کہ علامہ عبدالرحمٰن بن الجوزیؒ المتوفی ۵۹۷ھ کی کتابیں اغلاط سے پُر ہیں چنانچہ علامہ ذہبیؒ لکھتے ہیں کان کثیر الغلط فیما یصنفہ الی قولہ وھم کثیر فی توالیفہ الخ (تذکرۃ الحفاظ ج ۴ ص۱۳۶) یعنی ان کی تصنیفات، او تالیفات میں بے پناہ غلطیاں اور بہت زیادہ وہم شامل ہے۔

وثانیًا۔ ابن الجوزیؒ بڑے متشدد تھے وہ حسن بلکہ صحیح حدیثوں کو بھی جعلی قرار دے دیتے تھے چنانچہ ان کے متشدد ہونے کا شکوہ آلآثار المرفوعہ (ص۲۳ المنضمہ مع امام الکلام) میں موجود ہے اور امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ انہوں نے بہت سی ایسی حدیثیں جعلی قرار دی ہیں جن کے موضوع ہونے کی کوئی دلیل نہیں ہے (التقریب مع التدریب ص۱۸۱) اور امام سیوطیؒ لکھتے ہیں کہ انہوں نے حسن بلکہ صحیح بلکہ صحیح مسلم کی حدیث (ان طالت بك مدۃ اوشك ان ترٰی قومًا یغدون فی سخط اللہ الحدیث مسلم ج ۲ ص۳۸۳) کو بھی موضوع کہہ دیا ہے (تدریب الراوی ص۱۸۱ و ص۱۸۲ محصلہ)

وثالثاً[۳] مولانا عبدالحی لکھنویؒ نے الآثار المرفوعۃ ص۳۵۳ سے ص۳۷۴ تک تقریباً بیس[۲۰] صفحات میں صلوٰۃ التسبیح کی حدیث پر طویل علمی بحث کی ہے جس کا مختصر خلاصہ یہ ہے کہ صلوٰۃ التسبیح کی حدیث حضرت عباسؓ، حضرت عبداللہؓ بن عباسؓ، حضرت فضلؓ بن عباسؓ۔ حضرت عبداللہؓ بن عمروؓ۔ حضرت عبداللہؓ بن عمرؓ، حضرت ابورافعؓ حضرت علیؓ، حضرت جعفرؓ، حضرت عبداللہؓ بن جعفرؓ۔ حضرت ام سلمہؓ اور حضرت جابرؓ بن عبداللہؓ سے متعدد طرق سے مروی ہے بعض کی اسانید نہایت ہی کمزور بعض کی محض ضعیف اور بعض میں کذاب راوی ہیں لیکن بعض احادیث حسن بلکہ صحیح بھی ہیں اور حافظ ابن حجرؒ کی کتاب۔ کتاب الخصال المکفرۃ للذنوب المقدمۃ والمؤخرۃ کے حوالہ سے حضرت ابنِ عباسؓ کی ایک سند کے بارے میں نقل کرتے ہیں رجال اسنادہ لا بأس بھا اور امام ابن المدینیؒ کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں فھذا الاسناد من شرط الحسن اور جن حضرات محدثین کرامؒ نے صلوٰۃ التسبیح کی حدیث کو بعض اسانید یا تعدد طرق کی وجہ سے صحیح یا حسن قرار دیا ہے ان میں محدث ابن مندہؒ۔ امام آجریؒ۔ علامہ خطیبؒ۔ امام ابوسعد السمعانیؒ۔ حافظ ابوموسیٰ المدینیؒ۔ امام ابوالحسن بن مفضلؒ۔ امام منذریؒ۔ امام ابن الصلاحؒ۔ امام نوویؒ۔ امام دیلمیؒ۔ امام بیہقیؒ امام مسلمؒ۔ حافظ ابن حجرؒ حافظ العلائیؒ الشیخ سراج الدین البلقینیؒ۔ امام ابن المدینیؒ۔ امام ترمذیؒ۔ امام نسائیؒ امام ابن خزیمہؒ۔ امام ابن حبانؒ۔ امام حاکمؒ۔ امام دارقطنیؒ اور علامہ بدرالدین زرکشیؒ وغیرہ چوٹی کے محدثین کرامؒ کے نام ذکر کئے ہیں اور مولانا عبدالحیؒ فرماتے ہیں کہ ائمہ حفاظ نے دیگر بعض احادیث کی طرح اس کو بھی موضوعات میں شامل کرنے کی وجہ سے ابن الجوزیؒ کی سخت تردید کی ہے اور مولانا عبدالحیؒ نے صاف الفاظ میں تحریر فرمایا ہے۔

وقد تعقب ابن الجوزی جمع ممن جاء بعدہ امام ابن الجوزیؒ کے بعد آنے والے نقاد محدثین نے

من نقاد المحدثین وبینوا ان حدیث صلوٰۃ التسبیح صحیح وحسن عند المحققین وان ابن الجوزیؒ فی ذکرہ فی الموضوعات من المتساھلین (ط۳۵۶)

ان پر تنقید کی ہے اور یہ بیان کیا ہے کہ صلوٰۃ التسبیح کی حدیث محققین کے نزدیک صحیح یا حسن ہے اور ابن الجوزیؒ اس کو موضوعات میں درج کرنے کی وجہ سے خطا کاروں میں سے ہے۔

قارئین کرام ملاحظہ فرمائیں مؤلف مذکور کی جہالت اور خود غرضی کہ مولانا عبدالحیؒ کی کتاب الآثار المرفوعۃ فی الاخبار الموضوعۃ سے چوروں کی طرح ایک بات لے اُڑے ہیں اور ان کی بہترین علمی بحث کو گیارہویں شریف کی مٹھائی سمجھ کر ہڑپ کر گئے ہیں یہ ہے ان لوگوں کی اور ان کے وکیل محقق ومدقق کی دیانت فوا اسفاً۔

بیس۲۰ رکعت تراویح جمہور اُمّت کے نزدیک بیس رکعت نماز تراویح سنت مؤکدہ ہے لیکن جمہور کا مستدل ابراہیم بن عثمان کی حدیث نہیں جیسا کہ مؤلف مذکور نے اپنی کم علمی سے یہ سمجھ رکھا ہے جمہور کا مستدل مؤطا امام مالکؒ اور سنن الکبریٰ وغیرہ کی اس روایت سے ہے جو باسناد صحیح ہے جس میں ہے کہ خلیفۂ راشد حضرت عمرؓ کے عہد مبارک میں (اور ان کے حکم سے) باجماعت بیس۲۰ تراویح ہوتی رہیں اور حضرات صحابہ کرامؓ باقاعدہ اس میں شریک ہوتے رہے اور حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کی خلافت راشدہ کے دور میں بھی بلا نکیر البیاہی ہوتا رہا جس پر ایک گونہ اجماع ہوگیا اور تقریباً ۱۲۹۶ھ تک مشرق سے مغرب اور شمال سے جنوب تک ساری امت کا اس پر عمل ہوتا رہا ہے تاآنکہ ایک غالی غیر مقلد مفتی مولانا محمد حسین صاحب بٹالویؒ نے آٹھ کی بدعت نکالی ہے اور خود ان کے رد میں مشہور غیر مقلد عالم مولانا غلام رسول صاحبؒ قلعہ میاں سنگھ ضلع گوجرانوالہ نے رسالہ تراویح لکھا ہے جس کا ترجمہ راقم اثیم نے کیا ہے اور ساتھ ہی مقدمہ بنا بیع لکھا ہے اہلِ علم اس کا ضرور مطالعہ کریں۔

قرض کا وصیت سے قبل ہونا

مؤلف مذکور نے لکھا ہے کہ آئمہ اربعہ اور اصحاب ظواہر کے نزدیک میّت کے ترکہ سے پہلے قرض پھر وصیت ادا کی جائے گی حالانکہ ترمذی میں جو روایت آتی ہے وہ سخت ضعیف ہے جس میں حارث اعور جیسا کذاب موجود ہے (محصلہ)

الجواب: جس حدیث کا مؤلف مذکور نے حوالہ دیا ہے وہ ان الفاظ سے مروی ہے۔

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قضی بالدین قبل الوصیۃ الحدیث (ترمذی ج۲ ص۳۴) کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے وصیت سے قبل قرض ادا کرنے کا فیصلہ صادر فرمایا۔

اور امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ عام (یعنی سب) اہل علم کا اسی پر عمل ہے یعنی ایک گونہ اجماع ہے۔ بے شک اس روایت کی سند میں حارث اعور ہے اور وہ کذاب اور رافضی ہے لیکن کیا ضروری ہے کہ امت کا اجماع و اتفاق صرف اسی روایت پر مبنی ہو بہت ممکن ہے کہ ان کا مستدل وہ حدیث ہو جو آپ کے صدر الافاضل جناب مراد آبادی صاحب نے اپنی تفسیر میں نقل کی ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں اور دَین وصیت پر بھی مقدم ہے حدیث شریف میں ہے اَلدَّیْنُ قَبْلَ الْوَصِیَّۃِ انتہی (ص۱۱۵ طبع تاج کمپنی لاہور) پہلی حدیث آپ کی فعلی ہے کہ عملاً آپ نے فیصلہ صادر فرمایا اور یہ حدیث قولی ہے جیسا کہ بالکل ظاہر ہے حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ اس پر امت کا اتفاق ہے کہ دَین وصیت سے قبل ہے اور اس اتفاق سے اور اس باب کی بعض اور روایات سے اس کی تائید ہوتی ہے (فتح الباری وہامش بخاری ج۱ ص۳۸۴)

علاوہ ازیں نظر بہ ظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ مؤلف مذکور کو اس سے مغالطہ ہوا ہے کہ قرآن کریم میں وصیت کا ذکر پہلے اور قرض کا ذکر بعد کو ہوا ہے جس سے

وہ ترتیب سمجھے بیٹھے ہیں اور امت مسلمہ کے عمل کو اس سے متصادم پاکر حدیث پر
اس کی بنیاد قرار دے کر اپنا نظریہ لکھا ہے لیکن ان کو معلوم ہونا چاہیئے کہ حرف واؤ
ہو یا آو ہو ان میں ترتیب لازم اور ضروری نہیں ہوتی بجائے اس کے کہ ہم یہاں کتب
نحو کے حوالے درج کرکے اپنا قیمتی وقت صرف کریں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ انہی
کے بزرگ کا اسی آیت کے ذیل میں ایک حوالہ درج کرنے پر اکتفا کریں مفتی احمد یار
خان صاحب لکھتے ہیں کہ یہ بھی خیال رہے کہ قرضہ وصیت پر مقدم ہے مگر وصیت
کی اہمیت دکھانے کے لئے پہلے وصیت کا ذکر فرمایا اس سے معلوم ہوا کہ واؤ
اور آو ترتیب نہیں چاہتے انتہٰی (بلفظہٖ نور العرفان ص۱۲۴ طبع لاہور)

غرضیکہ امتِ مسلمہ کا عمل اور فتوٰی نہ تو قرآنِ کریم کے کسی حکم سے متصادم ہے
اور نہ حارث اعور جیسے کذاب کی روایت پر موقوف ہے اور نہ امتِ مسلمہ نے اپنے کسی
مسئلہ کی بنیاد محض کسی شدید ضعیف حدیث پر رکھی ہے یہ صرف مؤلف مذکور یا ان کے
غیر بالغِ نظر اساتذہ کی بے جان علمیت کا کرشمہ ہے کہ انہیں کچھ کا کچھ سمجھ آتا ہے۔

(۵) ہم قدرے تفصیل سے یہ بات پہلے عرض کر چکے ہیں کہ بلند آواز کے ساتھ تکبیر
اور ذکر سے منع کرنے کے بارے میں حضرت امام شافعیؒ کی محض اپنی رائے ہی نہیں
ہے بلکہ قرآن کریم میں آہستہ ذکر کرنے کا حکم اور صحیح احادیث جن میں آہستہ ذکر کرنے
کا حکم اور آہستہ ذکر کے خیر ہونے کا ارشاد ہے ان کے پیشِ نظر ہے اور وہ خود
کتاب الام میں باقاعدہ روایات کا حوالہ دے رہے ہیں جیسا کہ یہ بات عرض کر دی
گئی ہے اور سلف صالحینؒ اور جمہور فقہاء مجتہدین کی معیت بھی ان کو حاصل ہے
اور ید اللہ علی الجماعۃ ایک روشن حکم ہے جس سے کوئی بھی مسلمان انکار
نہیں کر سکتا یہ دوسری بات ہے کہ ع

تیرا ہی جی نہ چاہے تو باتیں ہزار ہیں

نمازوں کے بعد بلند آواز سے تکبیر کہنے کی بدعت

اللہ تعالیٰ کا ذکر ہر وقت اور ہر ایک سے فی نفسہٖ مطلوب ہے اور یہ اپنی جگہ بڑی عبادت ہے اس میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں اور نہ ہو سکتا ہے اور نمازوں کے بعد متواتر درجہ کی احادیث سے متعدد الفاظ کے ساتھ اذکار ثابت ہیں یہ بات بھی محل نزاع نہیں ہے اور اس میں بھی کوئی نزاع نہیں کہ امام مقتدیوں کی تعلیم کی خاطر کچھ عرصہ جہر کرتا ہے اور ان کے سیکھ چکنے کے بعد جہر ترک کر دے تو اس میں بھی کوئی مضائقہ نہیں حضرت ابن عباسؓ کی صحیح روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کے مبارک عہد میں فرضی نمازوں کے بعد بلند آواز سے ذکر اور تکبیر ہوتی تھی اور حضرت امام شافعیؒ اور دیگر آئمہ کرامؒ کے بیان کے مطابق جب تعلیم ہو چکی تو جہر بالتکبیر کو ترک کر دیا گیا اور بعد کو جہراً ایسا نہیں ہوتا تھا اور خود حضرت ابن عباسؓ کی یہ روایت بتاتی ہے کہ ان کے اس حدیث کو بیان کرتے وقت حضرات صحابہ کرامؓ میں جہر متروک تھا جیسا کہ علامہ کرمانیؒ اور عینیؒ وغیرہ نے اس کی تصریح کی ہے یہ سب امور صریح حوالوں کے ساتھ حکم الذکر بالجہر میں موجود ہیں۔ اور بفضلہٖ تعالیٰ ان میں سے ہر امر پر بقدر ضرورت اس میں سیر حاصل بحث کی گئی ہے یہ سب امور اتفاقی ہیں نزاع اس میں ہے کہ حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ کے دور میں ذکر بالجہر ہوتا تھا یا نہیں؟ اور ٹھوس حوالے اس پر موجود ہیں کہ ایسا نہیں ہوتا تھا اور یہ جملہ حوالے حکم الذکر بالجہر میں مذکور ہیں۔ قارئین کرام اسی میں ان کو ملاحظہ فرمائیں ہم یہاں مشہور محدّث۔ مفسر اور مورخ حافظ ابن کثیرؒ کی بقید حروف عبارت عرض کرتے ہیں غور فرمائیں حافظ ابن کثیرؒ ۲۱۶ھ کے حالات میں تحریر فرماتے ہیں کہ

وفیھا کتب المأمون الی اسحاق ۲۱۶ھ میں مأمون نے نائب بغداد اسحاق بن

بن ابراهیم نائب بغداد یأمرہ ان یأمر الناس
بالتکبیر عقیب الصلوٰت الخمس فکان
اول ما بدأ بذلك فی جامع بغداد
والرصافة یوم الجمعة لاربع عشر لیلة
خلت من رمضان وذلك انهم کانوا
اذا قضوا الصلوٰة قام الناس قیامًا
فکبروا ثلاث تکبیرات ثم استمروا
علی ذلك فی بقیة الصلوٰت وهذہ
بدعة احدثها المأمون ایضًا بلا مستند
ولا دلیل ولا معتمد فان هذا لم یفعله قبله
احد ولکن ثبت فی الصحیح عن ابن عباسؓ
ان رفع الصوت بالذکر کان علی
عهد رسول الله صلی الله تعالیٰ علیه
وسلم لیعلم حین ینصرف الناس من
المکتوبة وقد استحب هذا
طائفة من العلماء کابن حزم
وغیرہ وقال ابن بطالؒ المذاهب
الاربعة علی عدم استحبابه
وقال النوویؒ وقد روی عن الشافعیؒ
انه قال انما کان ذلك لیعلم الناس
أن الذکر بعد الصلوٰت مشروع

بن ابراہیم کو لکھا اور یہ حکم دیا کہ وہ لوگوں کو پانچوں
نمازوں کے بعد تکبیر کہنے کا حکم دے اور سب سے پہلے
یہ کاروائی جمعہ کے دن جب کہ رمضان المبارک کی
چودہ راتیں گذر چکی تھیں شروع ہوئی اور یہ کاروائی
یوں ہوئی کہ جب وہ نماز پوری کر چکتے تو لوگ
سیدھے کھڑے ہو جاتے (جیسا کہ آجکل اہل بدعت
درود شریف پڑھنے کے لئے کھڑے ہو جاتے ہیں۔
صفدر) پھر تین بار تکبیر کہتے اور پھر یہ کاروائی باقی
باقی نمازوں میں بھی مستمر رہی اور یہ کاروائی بدعت
ہے۔ اور مامون نے بلا کسی مستند اور دلیل اور
قابل اعتماد حجت کے یہ بدعت بھی گھڑی ہے
اور یہ کاروائی اس سے پہلے کسی نے نہیں کی لیکن
صحیح (بخاری) میں حضرت ابن عباسؓ سے ثابت
ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے عہد میں
بلند آواز کے ساتھ جب کہ آپ فرضی نماز سے
فارغ ہو جاتے تعلیم کی خاطر ذکر کیا جاتا تھا اور
اس کو علماء کے ایک طائفہ نے مثلاً ابن حزمؒ
وغیرہ مستحب سمجھا ہے اور ابن البطالؒ فرماتے
ہیں کہ مذاہب اربعہ اس کے عدم استحباب کے قائل
ہیں امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ امام شافعیؒ سے
روایت کیا گیا ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ یہ صرف

فلما علم ذلك لم يبق للجهر معنىً	اس لئے تھا کہ لوگوں کو بتایا جائے کہ نماز کے
وهذا كما روي عن ابن عباسؓ انه	بعد ذکر مشروع ہے جب اس کا علم ہو گیا تو جہر کا
كان يجهر في الفاتحة في صلوٰة الجنازة	کوئی مطلب ہی نہ رہا اور یہ ایسا ہی ہے جیسا
ليعلم الناس انها سنة وهذا	کہ ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ وہ نماز جنازہ
نظائر والله تعالىٰ اعلم واما هذه	میں جہر سے سورۃ فاتحہ پڑھتے تھے تاکہ لوگ
البدعة التي امر بها المأمون فانها	جان لیں کہ یہ بھی ایک طریقہ ہے اور اس کے
بدعة محدثة لم يعمل بها احد	کئی نظائر ہیں اور اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے بہرحال
من السلف الخ۔	یہ کاروائی جس کے بارے میں مامون نے حکم
(البداية والنهاية ج۱۰ ص۲۷۵)	دیا ہے یہ نرا نئی بدعت ہے سلف میں سے کسی
	ایک نے اس پر عمل نہیں کیا۔

قارئین کرام اس عبارت کو بار بار پڑھیں اور ملاحظہ فرمائیں کہ حضرات صحابہ کرامؓ تابعینؒ اور تبع تابعینؒ وغیرہم میں سے اگر کسی نے یہ کاروائی کی ہوتی تو یہ کبھی بدعت محدثہ نہ ہوتی مگر سلف میں سے تو کسی ایک نے بھی یہ نہیں کی اور یہ کاروائی مامون جیسے رافضی اور معتزلی خلیفہ کے ڈنڈے کے زور سے شروع ہوئی اور لوگ اس پر مجبور کئے گئے حافظ ابن کثیرؒ ہی لکھتے ہیں کہ عبداللہ المأمون بن ہارون الرشید العباسی القرشی کو اس کے بھائی کے معزول ہونے کے بعد ۱۹۸ھ میں جب کہ محرم کے پانچ دن باقی تھے خلیفہ بنایا گیا اور وہ بیس سال اور پانچ ماہ تک خلافت پر براجمان رہا۔

وقد كان فيه تشيع واعتزال وجهل	اور اس میں تشیع بھی تھا اور اعتزال بھی، اور
بالسنة الصحيحة اھ۔	سنت صحیحہ سے جہالت بھی۔
(البداية والنهاية ج۱۰ ص۲۷۵)	

اور درحقیقت بدعت بھی وہی کرتا ہے جو سنت صحیحہ سے ناواقف ہو یا اس میں اس کو اپنا مفاد نظر نہ آتا ہو اور حافظ ابنِ کثیر رح ہی لکھتے ہیں کہ

وکان علیٰ مذهب الاعتزال لانه اجتمع بجماعة منهم بشر بن غياث المريسي فخدعوه واخذ منهم هذا المذهب الباطل وكان يحب العلم ولم يكن له بصيرة نافذة فيه فدخل عليه بسبب ذٰلك الداخل وراج عنده الباطل ودعا اليه وحمل الناس عليه كرهاً وذٰلك فى اٰخر ايامه وانقضاء دولته (البداية والنهاية ج۱۰ ص۲۷۵)	وہ معتزلہ کے مذہب پر تھا کیونکہ وہ ایسی جماعت سے ملا جس میں بشر بن غیاث مریسی بھی تھا۔ جنہوں نے اس کو دھوکہ دیا اور اس نے اُن سے یہ باطل مذہب اخذ کیا۔ مأمون علم کو پسند کرتا تھا مگر اس کو اس میں کوئی گہری بصیرت نہ تھی اور اسی وجہ سے اس میں بدعقیدتی داخل ہوئی اور باطل اس کے ہاں رائج ہو گیا اور اس نے اس کی طرف لوگوں کو دعوت دی اور لوگوں کو جبراً اس پر آمادہ کیا، اور یہ کارروائی اس کے آخری ایام اور خلافت کے اختتام کے دور میں ہوئی۔

اس عبارت سے بالکل واضح ہوگیا کہ اس ظالم اور باطل پرست نے جو کچھ کیا اپنی خلافت اور ڈنڈے کے زور سے کیا اور لوگ مجبوراً یہ کارروائی کرتے رہے اور حقیقتِ حال اور دین کی روح سے ناواقف لوگ یہ سمجھے کہ بعض سلف طوعاً ایسا کرتے تھے اور لطف کی بات یہ ہے کہ مأمون نرا دنیادار ہی نہ تھا بلکہ حافظ قرآن بھی تھا اور رمضان مبارک کے مہینہ میں تینتیس مرتبہ قرآن کریم ختم کر لیتا تھا (البدایہ والنہایہ ج۱۰ ص۲۷۵) اور جابر خلیفہ کے بدعت کے کارنامہ پر اس کا استاد بشر مریسی معتزلی بڑا خوش تھا اس لئے کہ اس طریقہ سے ان کو اہل السنت و الجماعت سے جدا کرنے کا ایک نمایاں پہلو نظر آتا تھا جیسا کہ اہل بدعت حضرات

آج کل اپنی بدعات کو اپنی نمایاں علامات قرار دے کر خوش ہوتے ہیں۔

ولما ابتدع المأمون ما ابتدع من التشیع والاعتزال فرح بذلك بشر المریسی وکان بشر ھذا شیخ المأمون اھ

جب مأمون نے تشیع اور اعتزال کی بدعت گھڑی تو اس سے بشر مریسی بڑا خوش ہوا اور بشر مأمون کا استاد تھا۔

(البدایۃ والنہایۃ ج۱۰ ص۲۷۹)

عجیب بات ہے کہ بلند آواز سے درود پڑھنے کی بدعت بھی رافضیوں نے گھڑی۔ جیسا کہ حکم الذکر بالجہر میں اس پر حوالے موجود ہیں اور نمازوں کے بعد بلند آواز سے ذکر کی بدعت بھی معتزلی اور رافضی نے گھڑی ہے اور آج دونوں بدعتوں کو نام نہاد اہل السنت (جو درحقیقت خالص بدعتی ہیں) سینے سے لگائے پھرتے ہیں اور یہ ان کے نزدیک سنیوں کی نشانی ہے۔ فیا اسفا والی اللہ المشتکیٰ۔

باب دوم

الصّلوٰۃ والسّلام علیک یا رسول اللہ کا اثبات

ہم اور ہمارے اکابر رحمہ اللہ تعالیٰ درود شریف پڑھنے کو بڑی سعادت اور عبادت سمجھتے ہیں کیونکہ اس میں اللہ تعالیٰ سے دعا کی جاتی ہے کہ وہ اپنی برکتیں اور رحمتیں آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم اور آپؐ کی آل پر نازل کرے (جن میں حضرات صحابہ کرامؓ اور اہل بیت اور قیامت تک آنے والے تمام مومن مرد اور عورتیں داخل ہیں (ملاحظہ ہو جلاء الافہام ص۱۲ و ص۱۲۴) متعدد احادیث سے درود شریف کے مختلف الفاظ ثابت ہیں جن میں سب سے افضل اور بہتر درود شریف کے وہ الفاظ ہیں جو نماز میں پڑھے جاتے ہیں اور جس کو اصطلاح میں درود ابراہیمی کہتے ہیں لیکن اس کے علاوہ دیگر الفاظ سے بھی احادیث اور حضرات صحابہؓ کرام اور تابعینؒ سے درود شریف کے الفاظ ثابت ہیں حضرت حسن بصریؒ کی روایت میں آل کے لفظ کے علاوہ اصحابہ کے لفظ بھی ثابت ہیں کہ وہ یہ بھی پڑھتے ہیں (شفا قاضی عیاضؒ ج ۲ ص۵۷ والقول البدیع ص۳۵ وغیرہ) اور الصلوٰۃ والسلام علیک یا رسول اللہ کے الفاظ سے بھی ہمارے نزدیک درود شریف پڑھنا جائز ہے کیونکہ ان الفاظ سے مقصد آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم پر بطور دعا سلام بھیجنا ہوتا ہے

چنانچہ علامہ سمہودیؒ (المتوفی ۹۱۱ھ) لکھتے ہیں

یقصد الدعاء منا بالتسلیم علیہ من اللہ سواء کان بلفظ الغیبۃ او الحضور کقولنا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم والصلوٰۃ والسلام علیک یا رسول اللہ سواء کان من الغائب او الحاضر عندہ الخ (وفاء الوفاء ج۲ ص۴۰۳)

یعنی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور الصلوٰۃ والسلام علیک یا رسول اللہ کے الفاظ سے ہمارا مقصد اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپؐ پر سلامتی کی دعا ہے (اور یہ جائز ہے) یہ غائب سے ہو یا حاضر سے۔

ہاں اگر کوئی شخص یا رسول کے الفاظ سے آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کو حاضر و ناظر سمجھ کر یہ پڑھے یا آپ سے مدد مانگے تو البتہ ناجائز ہے، اور خاں صاحب بریلوی اسی معنی میں یا رسول اللہ کہتے ہیں چنانچہ وہ لکھتے ہیں ؎

بیٹھتے اُٹھتے مدد کے واسطے یا رسول اللہ کہا پھر تجھ کو کیا ؟

(حدائق بخشش حصہ دوم ص۵۰)

اور بانیٔ دار العلوم دیوبند حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ (المتوفی ۱۲۹۷ھ) تحریر فرماتے ہیں کہ "الصلوٰۃ والسلام علیک یا رسول بہت مختصر ہے مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حاضر و ناظر نہ سمجھنا چاہیئے ورنہ اسلام کیا ہوگا کفر ہوگا بلکہ یوں سمجھئے یہ پیغام فرشتے پہنچاتے ہیں والسلام (انتہیٰ بلفظہٖ فیوض قاسمیہ ص۲۸)

ساون کا اندھا

مثل مشہور ہے کہ ساون کے اندھے کو ہر چیز ہری بھری ہی محسوس ہوتی ہے یہی حال مؤلف مذکور کا ہے ان کو امام نوویؒ کی عبارات سے الصلوٰۃ والسلام علیک یا رسول اللہ ہی سمجھ آیا ہے اس لئے کہ بفہم او اس میں صلوٰۃ اور سلام کے الفاظ موجود ہیں چنانچہ مؤلف مذکور یہ عنوان قائم کرتے ہیں۔ الصلوٰۃ والسلام علیک یا رسول اللہ اور اس کے اثبات کے لئے حضرت امام نوویؒ کا یہ حوالہ دیتے ہیں۔

يستحب لقارئ الحديث وغيره ممن في معناه اذا ذكر رسول الله صلى الله تعالیٰ علیہ وسلم ان یرفع صوتہ بالصلوٰۃ والتسلیم علیہ ولا یبالغ فی الرفع مبالغۃ فاحشۃ الخ (کتاب الاذکار صلا)

حدیث شریف اور اس کے ہم معنی کلام پڑھنے والے کے لئے مستحب ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ذکر مبارک آئے تو بلند آواز سے آپ پر صلوٰۃ وسلام پڑھے، اور آواز بلند کرنے میں زیادہ مبالغہ نہ کرے۔

(ذکر بالجہر صت ۲۰۹) اور پھر صلا ۲۱۱ میں یہ عنوان قائم کرتے ہیں "الصلوٰۃ والسلام علیک یارسول اللہ کی تحقیق۔ پھر آگے امام نووی رح کا یہ حوالہ لکھتے ہیں۔

وقد نص العلماء علی کراھۃ الاقتصار علی الصلوٰۃ علیہ صلی اللہ علیہ وسلم من غیر تسلیم (نووی شرح مسلم ج ۱ ص ۲)

ہمارے علماء نے تصریح کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر بغیر سلام کے صرف صلوٰۃ پڑھنا مکروہ ہے۔

اس وجہ سے درود ابراہیمی پر اقتصار کر کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر صرف صلوٰۃ پڑھنا کراہت سے خالی نہیں ہے باقی رہا یہ امر کہ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے درود ابراہیمی کی تعلیم کیوں دی تو اس کا جواب یہ ہے کہ حضور نے درود ابراہیمی نماز میں پڑھنے کا حکم دیا ہے اور نماز میں چونکہ تشہد کے دوران السلام علیک ایھا النبی کے ساتھ پہلے سلام پڑھ لیا جاتا ہے لہذا وہاں فقط صلوٰۃ پر اقتصار لازم نہیں آتا۔ الخ (ذکر بالجہر صلا ۲۱۱)

الجواب :۔ مؤلف مذکور اپنی جہالت کی وجہ سے صلوٰۃ وسلام کے الفاظ سے معہود الصلوٰۃ والسلام علیک یارسول اللہ سمجھے ہیں حالانکہ اصل بات یہ ہے کہ امام مسلم رح نے کتاب کے خطبہ میں وصلی اللہ علی محمد کے الفاظ تحریر کئے ہیں اور سلام کا لفظ نہیں لکھا اس پر امام نووی رح گرفت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ امام مسلم رح کے لئے مناسب تھا کہ وہ وصلی اللہ وسلم علی محمد تحریر کرتے کیونکہ ارشاد

خداوندی یہ ہے صَلُّوا عَلَیْہِ وَسَلِّمُوا تَسْلِیْمًا اور حضرات صحابہ کرامؓ بھی یوں فرماتے تھے یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لہذا صرف صلوٰۃ پر اکتفاء کرنے کو علماء نے مکروہ کہا ہے (محصلہ نووی شرح مسلم ج ۱ ص۲) مطلب یہ ہوا کہ جب آپؐ کا اسم گرامی آئے تو صرف صلی اللہ علیہ نہیں کہنا چاہیئے بلکہ وسلم بھی ساتھ کہنا چاہیئے اور جس نے آپ کے اسم گرامی کے ساتھ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کہا اس نے صَلُّوا عَلَیْہِ وَسَلِّمُوا تَسْلِیْمًا پر عمل کیا اور رحمہ اللہ تعالیٰ ہم اور ہمارے اکابر تو کیا ساری متاؤب امت صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ سے آپؐ کا ذکر مبارک کرتی ہے یہی امام نوویؒ مقدمہ شرح مسلم میں لکھتے ہیں کہ

یستحب لکاتب الحدیث اذا مر بذکر اللہ عزوجل ان یکتب عزوجل او تعالیٰ او سبحانہ وتعالیٰ او تبارک وتعالیٰ او جل ذکرہ او تبارک اسمہ او جلت عظمتہ اوما اشبہ ذٰلک وکذٰلک یکتب عند ذکر النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بکمالھما لا رامزًا الیھما ولا مقتصرًا علی احدھما الیٰ ان قال وینبغی للقاری ان یقرأ کل ما ذکرناہ وان لم یکن مذکورًا فی الاصل الذی یقرأ منہ ولا یسأم من تکرار ذٰلک الخ (ص۲۰)

حدیث لکھنے والے کے لئے یہ مستحب ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کا اسم گرامی آئے تو اس کے ساتھ عزوجل یا تعالیٰ یا سبحانہ وتعالیٰ یا تبارک وتعالیٰ یا جل ذکرہ یا تبارک اسمہ یا جلّت عظمتہ یا ان کی مانند تعظیمی الفاظ لکھے اور اسی طرح جب آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کا نام مبارک آئے تو ساتھ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پورا لکھے اشارہ نہ لکھے (مثلاً یا صلعم وغیرہ نہ لکھے) اور صلوٰۃ وسلام دونوں لکھے ایک پر اکتفا نہ کرے پھر آگے فرمایا اور اسی طرح پڑھنے والے کو مناسب ہے کہ یہ سب کچھ پڑھے اور تکرار سے نہ اکتائے اگرچہ کتاب میں یہ الفاظ موجود نہ ہوں۔

الغرض امام نوویؒ تو یہ بتا رہے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا نام مبارک جب آئے تو صرف صلی اللہ تعالیٰ علیہ پر اقتصار اور اکتفاء نہ کرے بلکہ ساتھ وسلم بھی لکھے اور پڑھے اور کتب حدیث میں بار بار نام مبارک آجانے کی وجہ سے ان الفاظ کے لکھنے اور پڑھنے سے نہ اکتا جائے مگر ساون کے اندھے کو امام نوویؒ کی عبارت میں صلوٰۃ و تسلیم کے الفاظ سے موعود الصلوٰۃ والسلام علیک کا سوجھا ہے جبھی تو یہ عنوان قائم کیا ہے اللہ تعالیٰ سوء فہم سے بچائے مگر بدعات و رسومات کے حلوے کھیریں کھانے کے بعد علمی بصیرت رہتی ہی کہاں ہے؟ قرآن کریم کی نص قطعی سے صلوٰۃ و سلام کے دونوں لفظ ثابت ہیں اور حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف کی روایت میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھ سے حضرت جبرائیل علیہ السلام نے ملاقات کی اور یہ خوشخبری دی کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

من صلی علیک صلوٰۃ صلیت علیہ ومن سلم علیک سلمت علیہ فسجدت لذلک (جلاء الافہام ص۳۳)

کہ جس نے تجھ پر صلوٰۃ پڑھی میں اس پر رحمت نازل کروں گا اور جس نے تجھ پر سلام پڑھا، میں اس پر سلامتی نازل کروں گا تو میں یہ سن کر (شکریہ کے طور پر) سجدہ میں پڑ گیا۔

امام سخاویؒ نے یہ روایت امام احمدؒ۔ امام ابن ابی عاصمؒ۔ امام بیہقیؒ۔ امام عبدؒ بن حمیدؒ۔ امام ابن شاہینؒ اور امام حاکمؒ وغیرہ کے حوالہ سے نقل کی ہے اور لکھتے ہیں کہ امام حاکمؒ فرماتے ہیں ھذا حدیث صحیح (القول البدیع ص۷۹) اور ص۸۰ میں ایک اور سند کے ساتھ حضرت جبرائیل علیہ السلام کی من جانب اللہ تعالیٰ خوشخبری ان الفاظ سے بیان کی ہے یا محمد الی قولہ من صلی علیک منھم صلی اللہ علیہ ومن سلم علیک منھم سلم اللہ علیہ اور پھر اس کے

بارے میں علامہ سخاویؒ فرماتے ہیں وھو حدیث حسن و رجال ھذا السند من رجال الصحیح لکن فیہ عنعنۃ ابی الزبیر اھ لیکن کتاب الاحکام فی اصول الاحکام ج ۲ ص۱۴۱ لابن حزمؒ اور توجیہ النظر ص۲۵ وغیرہ اصول حدیث کی کتابوں میں تصریح موجود ہے ابو الزبیر محمدؒ بن مسلمؒ بن تدرسؒ ان مدلسین میں شمار ہوتے ہیں جن کی تدلیس قطعاً مضر نہیں اور صحیح مسلم میں ان کی بے شمار روایتیں عنعنہ کے ساتھ موجود ہیں اس صحیح حدیث سے بھی ثابت ہوا کہ درود شریف میں صلوٰۃ وسلام کے دونوں لفظ ہونے چاہئیں اور ترمذی ج ۱ ص۴۲ کی روایت میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم جب مسجد میں داخل ہوتے تو صلی علیٰ محمد وسلم ـــــــ صلوٰۃ وسلام دونوں لفظ پڑھتے۔

امام ترمذیؒ فرماتے ہیں یہ حدیث حضرت فاطمہؓ سے مرفوعاً مروی ہے اور حدیث حسن ہے اور فرماتے ہیں اس کی سند متصل نہیں کیونکہ فاطمہؒ بنت الحسینؓ نے حضرت فاطمہؓ کو نہیں دیکھا کیونکہ حضرت فاطمہؓ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بعد صرف چھ ماہ زندہ رہیں لیکن امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ اس باب میں حضرت ابو حمیدؓ۔ حضرت ابو اُسیدؓ اور حضرت ابو ہریرہؓ سے بھی روایتیں موجود ہیں غالباً تعدد طرق کی وجہ سے امام ترمذیؒ نے اس حدیث کو حسن کہا ہے اور حافظ ابن القیمؒ نے سند کے ساتھ حضرت فاطمہؓ کی روایت نقل کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم مسجد میں داخل ہو تو یہ کہو بسم اللہ والحمد للہ اللھم صل علیٰ محمد وسلم (جلاء الافہام ص۴۴) اور نزل الابرار میں مصنف ابن ابی شیبہ وغیرہ کے حوالہ سے حضرت فاطمہؓ کی روایت سے یہ مضمون نقل کیا ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم مسجد میں داخل ہوتے تو یہ پڑھتے بسم اللہ والصلوٰۃ والسلام علیٰ رسول اللہ الخ (حاشیہ جلاء الافہام ص۴۵)

الغرض ان مرفوع روایات سے درود شریف میں اللّٰھُمَّ صَلِّ علیٰ مُحَمَّدٍ وَسَلِّمْ اور الصلوٰۃ والسلام علیٰ رسول اللہ کے الفاظ بھی ثابت ہیں لہذا صلوٰۃ وسلام کا مصداق الصلوٰۃ والسلام علیک یا رسول اللہ ہی میں منحصر نہیں ہے جیسا کہ اہل بدعت عموماً اور مؤلف ذکر بالجہر خصوصاً اپنی جہالت سے یہ سمجھے بیٹھے ہیں اور اُلٹا اہل حق کو کوستے ہیں مگر یاد رہے کہ ؎

جنہیں حقیر سمجھ کر بجھا دیا تو نے   وہی چراغ جلیں گے تو روشنی ہو گی

صلوٰۃ وسلام میں کسی ایک پر کسی موقع پر اقتصار مکروہ نہیں

اگرچہ امام نوویؒ نے یہ لکھا ہے کہ صلوٰۃ وسلام میں ایک لفظ پر اقتصار مکروہ ہے لیکن ان کا قول مطلق نہیں بلکہ مقید ہے چنانچہ علامہ سخاویؒ لکھتے ہیں کہ

وقد صرّح النووی رحمہ اللہ تعالیٰ فی الاذکار وغیرہ بالکراھۃ واستدل بورود الامر بھما معاً فی الأیۃ قال شیخنا وفیہ نظر نعم یکرہ ان یفرد الصلوٰۃ ولا یسلم اصلاً اما لو صلّی فی وقت وسلم فی وقت اٰخر فانہ یکون ممتثلاً انتھی (القول البدیع صہ ٢)

امام نوویؒ نے کتاب الاذکار وغیرہ میں کراہت کی تصریح کی ہے اور دلیل یہ پیش کی ہے کہ آیت میں صلوٰۃ وسلام دونوں کا معاً امر وارد ہوا ہے۔ ہمارے شیخ (حافظ ابن حجرؒ) فرماتے ہیں کہ امام نوویؒ کے قول میں کلام ہے کراہت تو جب ہو کہ کوئی شخص صرف صلوٰۃ ہی پڑھے اور سلام بالکل نہ پڑھے لیکن اگر کوئی شخص کسی وقت صلوٰۃ پڑھے اور کسی وقت سلام پڑھے تو وہ شخص حکم خداوندی کی تعمیل کرنے والا ہے۔

مطلب بالکل واضح ہے کہ اگر کوئی شخص درود ابراہیمی پڑھتا ہے لیکن کسی وقت وہ سلام بھی پڑھتا ہے مثلاً اللّٰھُمَّ صَلِّ علیٰ مُحَمَّدٍ وَسَلِّمْ یا الصلوٰۃ والسلام علیٰ

رسول اللہ یا آپ کا اسم گرامی سُن کر صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پڑھتا ہے (اور کون با علم اور باشعور مسلمان ہے جو آپ کا اسم گرامی سُن کر صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نہیں پڑھتا) تو وہ آیت کریمہ کے حکم کی تعمیل کرنے والا ہے اور نماز میں تو بہر حال دونوں پڑھے جاتے ہیں اور اس کا مؤلف مذکور کو بھی صریح الفاظ میں اقرار ہے لہٰذا آیت میں ذکر کردہ حکم کی تعمیل الصلوٰۃ والسلام علیک یا رسول اللہ کہنے اور پڑھنے پر ہی موقوف نہیں جو موقف مذکور وغیرہ اہل بدعت کا غلط اور بے بنیاد دعویٰ ہے یہ بات بھی فائدہ سے خالی نہ ہوگی کہ اگرچہ جمہور علماء اسلام یہ فرماتے ہیں اور اسی میں احتیاط ہے اور یہی جمہور کا قول ہے (محصلہ التفسیرات الاحمدیہ ص۴۱۳) لیکن ملا جیون الشیخ احمد جونپوری الحنفیؒ لکھتے ہیں کہ

فعندنا مالکؒ والطحاویؒ یجب فی العمر مرۃ والباقی مندوب (التفسیرات الاحمدیہ ص۴۱۳)

امام مالکؒ اور امام طحاویؒ کے نزدیک زندگی بھر میں صرف ایک ہی دفعہ درود شریف پڑھنا واجب ہے باقی مستحب ہے

گویا ان حضرات کے نزدیک زندگی بھر میں صرف ایک دفعہ درود شریف پڑھنے سے صَلُّوْا عَلَیْہِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا کی تعمیل ہو جاتی ہے اور وہ کون مسلمان ہو سکتا ہے جو زندگی بھر میں ایک مرتبہ بھی نماز نہ پڑھے۔ علاوہ ازیں خانصاحب لکھتے ہیں۔

الجواب ۔ سب درودوں سے افضل وہ درود ہے جو سب اعمال سے افضل یعنی نماز میں مقرر کیا گیا ہے الخ (فتاویٰ رضویہ ج ۳ ص۸۴)

درود شریف آپ کو فرشتے پہنچاتے ہیں

یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ درود شریف خواہ درود ابراہیمی ہو یا الصلوٰۃ والسلام علیک یا رسول اللہ کے الفاظ سے ہو صحیح روایات کے پیش نظر (جس کی تخریج اور تحقیق ہم نے تبرید النواظر اور تسکین الصدور میں کر دی ہے)۔ فرشتے آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کو پہنچاتے ہیں آپ براہ راست خود نہیں سُنتے جیسا کہ اہل بدعت کا باطل نظریہ ہے اور مؤلف مذکور نے بھی ص۲۶۶ میں یہ

عنوان قائم کرکے کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا درود شریف سننا پہلے دو غیر متعلق حدیثیں نقل کی ہیں ایک حدیث قرع النعال اور دوسری حضرت ابن عباسؓ کی مرفوع حدیث ما من احد یمر بقبر اخیہ الحدیث (ان دونوں کی مفصل بحث ہم نے سماع الموتیٰ میں کردی ہے) پھر نتیجہ یہ نکالتے ہیں۔ غور فرمائیے! عام مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ وفات کے بعد ان کے ادراک کے لئے حدود وقیود کی پابندی نہیں رہتی تو جن کا زندگی میں بھی یہ عالم تھا کہ زمین پر رہتے ہوئے عرش وفرش کی آوازیں سنتے تھے تو وصال کے بعد ان کے قوائے مدرکہ مزید بڑھ گئے ہوں گے ان کی سماعت کا کیا عالم ہوگا (بلفظہٖ ص۲۲)

الجواب: ان دونوں حدیثوں سے صرف یہ ثابت ہے کہ دفن کے بعد جب (قبر میں میت کی طرف روح لوٹادی جاتی ہے ملاحظہ ہو تسکین الصدور) لوگ قبر سے واپس ہونے لگتے ہیں تو ان کی جوتیوں کی کھٹکھٹاہٹ مدفون سنتا ہے اور جب قبر کے پاس سے کوئی گذرتا ہے اور سلام کہتا ہے تو مدفون اس کا سلام سن کر (آواز سے اس کی شناخت کرکے یا بلا شناخت) اس کو جواب دے دیتا ہے ان حدیثوں سے یہ کیسے اور کیونکر ثابت ہوا کہ وفات کے بعد حدود اور قیود کی پابندی نہیں رہتی، کیا عرب میں کوئی مدفون عجم کے لوگوں کی جوتیوں کی آہٹ سنتا ہے؟ یا ان کا سلام سنتا ہے؟ یا مشرق کا مغرب والوں کی اور جنوب کا شمال والوں کی یا زیر زمین فرش پر پڑا ہوا عرش کے ملائکہ مقربین کی باتیں سنتا ہے؟ ان حدیثوں میں وہ کونسا لفظ ہے جو مرنے کے بعد حدود وقیود کو اٹھاتا ہے؟ مؤلف مذکور نے یہ کیسی نکمی اور واہیات بات لکھ ماری ہے بات صرف یہ ہے کہ جیسے زندگی میں قریب سے سنتا ہے اسی طرح قبر میں بھی قریب سے سنتا ہے جیسے زندگی میں دور سے نہ سننے کی حدود اور قیود اس پر لاگو تھیں وہ بدستور مرنے کے بعد بھی ہیں معجزہ۔ کرامت

اور خرق عادت کا معاملہ ہی جُدا ہے ان کو درمیان میں لا کر خلط مبحث عقلمندوں کو زیب نہیں دیتا۔ مؤلف مذکور کا یہ کہنا کہ جن کا زندگی میں یہ عالم تھا کہ زمین پر رہتے ہوئے عرش و فرش کی آوازیں سنتے تھے الخ نہ معلوم یہ کس قطعی دلیل سے ثابت ہے اس پر قرآن کریم کی کوئی نص موجود ہے یا خبر متواتر ہے یا کم از کم خبر واحد صحیح ہی صراحت سے موجود ہو مگر افسوس کہ مؤلف مذکور نے اپنی علمی تھیلے اور پٹاری سے کوئی دلیل نکالی نہیں تاکہ اس کا تانا بانا بھی دیکھ لیا جاتا ہم یہاں اس پر بحث اس لئے نہیں کرنا چاہتے کہ ہم نے بفضلہ تعالیٰ ازالۃ الریب اور تنقید النواظر وغیرہ میں اس پر سیر حاصل بحث کر دی ہے یہاں صرف بخاری شریف کی ایک ہی حدیث کا حوالہ درج کرتے ہیں کہ جب لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِیِّ الآیۃ نازل ہوئی۔

قال ابن الزبیر فما کان عمر یُسمع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حتی یستفهمہ الحدیث (بخاری ج ۲ ص ۷۱۸) تو عبداللہ بن زبیرؓ فرماتے ہیں کہ حضرت عمرؓ اتنے آہستہ بولتے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو (آپؐ سے غیر متعلق) بات سنائی ہی نہیں دیتی کہ آپؐ خود حضرت عمرؓ سے سوال فرماتے (کہ عمرؓ تم نے کیا کہا ہے)

مؤلف مذکور تو فرش پر مان کر عرش و فرش کی آوازیں سننے کا باطل دعویٰ کرتے ہیں مگر یہ صحیح روایت تو صاف بتاتی ہے کہ آپ فرش پر پاس بیٹھے ہوئے حضرت عمرؓ جیسی شخصیت کی آہستہ آواز کو بھی نہیں سُنتے تھے تاوقتیکہ آپؐ دریافت نہ فرمالیتے کہ عمرؓ تم نے کیا کہا ہے؟ مگر کیا کیا جائے مبتدعین کا باوا آدم ہی نرالا ہے۔

کیا درود شریف پڑھنے والے کی آواز آپؐ خود سنتے ہیں

مؤلف مذکور حافظ ابن القیمؒ کی کتاب جلاء الافہام ص ۶۳ سے ان کی نقل کردہ سند کے ساتھ حضرت ابوالدرداءؓ

کی مرفوع روایت نقل کرتے ہیں جس میں یہ بھی ہے کہ جمعہ کے دن مجھ پر بکثرت درود پڑھا کرو کیونکہ اس دن فرشتے حاضر ہوتے ہیں۔

لیس من عبد یصلی علیّ الا بلغنی صوتہ حیث کان الحدیث — کوئی شخص مجھ پر درود نہیں پڑھتا مگر مجھ تک اس کی آواز پہنچتی ہے۔

اس حدیث پر حضرت تھانوی رحؒ نے بوادر النوادر (ص۲۷۲) میں علمی بحث کی ہے جس سے مؤلف مذکور خاصے برہم ہوتے ہیں ان کی تین باتیں تو مؤلف مذکور نے نقل کی ہیں لیکن باقی حصہ کو ترک کرنے ہی میں خیر سمجھی ہے مولانا تھانوی رحؒ نے ایک بات یہ فرمائی ہے کہ اس کی سند میں یحیٰی بن ایوب ہے جو بلا نسب ہے (یعنی نسبت کے بغیر ہے) اس نام کے کئی راوی ہیں ایک غافقی ہے احتمال ہے کہ یہاں وہی ہے اور وہ ربما اخطأ ہے یعنی کبھی خطا کرتا تھا دوسرے خالد بن زید بھی غیر منسوب ہیں اس نام کے رواۃ میں سے ایک کی عادت ارسال کی ہے اور یہاں عنعنہ سے روایت ہے جس میں غیر ثقہ راوی کے متروک ہونے کا احتمال ہے تیسرے ایک راوی سعید بن ابی ھلال ہے جس کو ابن حزم رحؒ نے ضعیف اور امام احمد رحؒ نے مختلط کہا ہے وھذا کلہ من التقریب (بوادر النوادر ص۲۷۲)

اس پر مؤلف مذکور نے گرفت کرتے ہوئے جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ جلاء الافہام کی سند میں یحیٰی بن ایوب العلاف ہے جو سعید بن ابی مریم سے روایت کرتا ہے اور وہ ثقہ ہے غافقی نہیں جو ضعیف ہے اور تعجب ہے کہ تھانوی صاحب رحؒ کو مشترک ناموں کے درمیان امتیاز کا سلیقہ ہی نہیں ہے، یہ حدیث حضور کے کمال سماع کو ثابت کرتی ہے لیکن تھانوی صاحب رحؒ رسول اللہ کے خلاف دل میں چھپے ہوئے بغض کی وجہ سے خیانت کرتے ہوئے راوی کو غافقی قرار دیتے ہیں اور خالد بن زید کے بارے میں لکھتے ہیں کہ وہ بھی غیر منسوب ہے

سبحان اللہ کیا ہی مدلل جرح ہے اگر خالد بن زید کی عادت ارسال ہے تو کیا حدیث مرسل حجت نہیں اصول حدیث میں تصریح ہے کہ احناف و مالکیہ کے نزدیک حدیث مرسل مطلقاً مقبول ہوتی ہے۔ اگر خالد عنعنہ کی وجہ سے ساقط الاعتبار ہے، تو صحاح ستہ کی تمام معنعن احادیث سے ہاتھ اٹھا لیں تھانوی صاحبؒ نے بے سند احتمالات بیان کئے ہیں اور سعیدؒ بن ابی ہلالؒ کو ابن حزمؒ نے ضعیف کہا ہے تو ابن حزم بدباطن اور گستاخ شخص ہے وہ تو آئمہ مجتہدین کو بھی سفہوا اور کذبوا سے تعبیر کرتا ہے اور امام ترمذیؒ کو وہ مجہول کہتا ہے اور امام احمدؒ کا اس کو مختلط کہنا یہ ان کی منفرد رائے ہیں جمہور محدثین اس کی توثیق کرتے ہیں (محصلہ ذکر باجبر ص ۲۲۸ تا ص ۱۳۱)

الجواب حضرت تھانویؒ انسان ہیں اور خطا و نسیان انسان کے خمیر میں ودیعت کیا گیا ہے اور معصوم صرف وہی ہے جس کو اللہ تعالیٰ محفوظ رکھے لیکن جس انداز سے مؤلف مذکور نے ان پر گرفت کی ہے وہ درست نہیں ہے۔

اولاً تو اس لئے کہ جلاء الافہام کے مصری نسخہ میں یحییٰ بن ایوب کے ساتھ العلاف کی نسبت موجود ہے مگر مولانا تھانویؒ کا یہ کہنا کہ جو بلا نسب ہے اسی بات کا واضح قرینہ ہے کہ ان کے پیش نظر جو سند ہے اس میں یہ نسبت نہیں ہے، ورنہ ایک دیانت دار اور ذہین آدمی العلاف کی نسبت دیکھ کر یہ کبھی نہیں کہہ سکتا کہ غیر منسوب ہے راقم اثیم نے آج سے تقریباً چالیس سال پہلے جلاء الافہام کا وہ ہندی نسخہ دیکھا جس کے ساتھ اُردو ترجمہ خیر الکلام بھی تھا اس میں بے شمار اغلاط تھیں الحسین کی جگہ الحبین اس میں درج تھا اور اسی طرح اور اغلاط اس میں تھیں الغرض حضرت تھانویؒ کے سامنے بھی کوئی ایسا نسخہ یا کسی کتاب کے حوالہ سے یہ سند ایسی تھی جس میں نسبت مذکور نہیں ہوگی اور مصری نسخہ میں العلاف کی نسبت موجود ہے اور بظاہر یہی صحیح ہے اور بڑے بڑے آئمہ کو درایت اور روایت

معنی اور سند میں غلطیاں ہوتی رہی ہیں اور کوئی ان پر پھبتی نہیں اُڑاتا خود مؤلف مذکور کو امام شافعیؒ کی سند میں ابراہیم بن محمد کے بارے میں خالص جاہلانہ مغالطہ لگا ہے اور اسی تبصرہ میں بفضلہ تعالیٰ ہم نے وضاحت کر دی ہے اور خالد بن زید کی تعیین مؤلف مذکور بھی کتب اسماء الرجال سے نہیں کر سکے راقم اثیم کا خیال ہے کہ کتابت کی غلطی ہے راوی اس سند میں خالد بن یزید ہے جو المصری ہے اور یہ سعید بن ابی ہلال المصری سے روایت کرتا ہے اور یہ ثقہ راوی ہے (ملاحظہ ہو تہذیب التہذیب ج ۳ ص ۱۲۹ وغیرہ) حضرت تھانویؒ کی عبارت میں جس ارسال کا ذکر ہے اس سے اصطلاحی مرسل مراد نہیں جیسا کہ مؤلف مذکور نے اپنی جہالت سے یہ سمجھ کر لکھا ہے کہ اصول حدیث میں تصریح موجود ہے کہ احناف اور مالکیہ کے نزدیک مرسل مطلقاً مقبول ہوتی ہے الخ بلاشک احناف اور مالکیہ بلکہ جمہور کے نزدیک مرسل حجت ہے اور ہم نے احسن الکلام میں اس پر بقدر ضرورت باحوالہ بحث کی ہے لیکن یہاں ارسال سے اصطلاحی مرسل مراد نہیں کیونکہ اصطلاحی مرسل وہ ہوتا ہے جس میں صحابی کا نام مذکور نہ ہو اور چونکہ الصحابۃ کلھم عدول کا قاعدہ اہل السنت والجماعت کے نزدیک ایک مسلم حقیقت ہے اس لئے صحابی کا ذکر نہ ہونا مضر نہیں اور اس روایت میں حضرت ابو الدرداءؓ کا نام باقاعدہ موجود ہے لہٰذا یہ اصطلاحی مرسل نہیں ہے جس کو جمہور حجت کہتے ہیں یہاں لغوی ارسال مراد ہے وہ یہ کہ راوی راویوں کے نام حذف کر دیتا اور اڑا دیتا ہے اور ظاہر بات ہے کہ صحابہ کرامؓ سے نیچے تابعینؒ میں سے کسی کا نام مذکور نہ ہو تو چونکہ ان میں ثقہ یا ضعیف ہونے کا احتمال ہوتا ہے اس لئے یہ روایت اصطلاحاً منقطع کہلاتی ہے اور ضعف کا سوال اس میں بدستور موجود ہوتا ہے مؤلف مذکور نے اصول حدیث کے فن سے بے خبری کی وجہ سے لفظ ارسال کو اصطلاحی

مرسل پر چسپیاں کر کے محض اپنے ماؤف دل کی بھڑاس نکالی ہے علامہ ابن حزم الظاہریؒ کو گستاخ اور بد باطن کہنا تو بڑی جسارت ہے ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ تلی کی بیماری کی وجہ سے طبیعت میں حدت اور شدت ضرور تھی اور تنہا ان کا کسی راوی کو ضعیف کہہ دینا اس کے ضعیف ہونے کے لئے کافی نہیں اور سعیدؒ بن ابی ہلالؒ کے مختلط ہونے کا حکم بھی امام احمدؒ سے ہم مان لیتے ہیں کہ اس میں تفرد ہیں مگر اس سند کے غیر معتبر ہونے کی اصل وجہ کچھ اور ہی ہے جس کو مؤلف مذکور نہیں سمجھے اور ان کو اس کی ضرورت بھی نہ تھی۔ اصل بات یہ ہے کہ سعیدؒ بن ابی ہلالؒ کی روایت حضرت ابوالدرداءؓ سے منقطع ہے کیونکہ حضرت ابوالدرداءؓ (عویمرؓ بن زید) کی وفات ۳۲ھ میں ہوئی (تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۴ والاکمال ص ۵۹۴ وغیرہ) اور سعیدؒ بن ابی ہلالؒ کی ولادت ۷۰ھ میں ہوئی ہے (تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۹۵ وغیرہ) ظاہر بات ہے کہ سعیدؒ بن ابی ہلالؒ اپنی ولادت سے اڑتیس سال قبل وفات پانے والے صحابی حضرت ابوالدرداءؓ سے کیسے روایت کر سکتے ہیں؟ اور درمیان کے راوی کا پتہ نہیں کہ وہ کون اور کیسا ہے؟ اس لئے ایسی منقطع اور بے سروپا روایت پر مدار رکھ کر نصوص قطعیہ احادیث صحیحہ اور فقہاء ملت کے صریح فتووں کے خلاف دور سے سماعت کا مسئلہ بطور ضابطہ کے کیونکر صحیح ہو سکتا ہے؟ اور کون مسلمان اس کو تسلیم کرنے کے لئے تیار ہے؟ ابن ماجہ ص ۱۱۹ کی ایک اور سند میں سعیدؒ بن ابی ہلالؒ اور حضرت ابوالدرداءؓ کے درمیان دو واسطے مذکور ہیں سند یوں ہے عن سعید بن ابی هلال عن زید بن ایمن عن عبادۃ بن نسی عن ابی الدرداءؓ تو اس سے معلوم ہوا کہ درمیان میں دو واسطے نہ سہی کم از کم ایک تو ضرور ساقط ہے اور روایت بہر حال منقطع ہے۔

حضرت تھانویؒ نے اس روایت کے بارے جو باتیں فرمائی ہیں بعض کا

ہو چکا اور مزید کچھ باتیں ہیں جن کو مؤلف مذکور شربت صندل سمجھ کر بالکل پی گئے ہیں جن میں دو یہ ہیں اوّل مشکوٰۃ۔ نسائی۔ دارمی۔ حصن حصین۔ مستدرک حاکم اور ابن حبان وغیرہ میں حضرت ابن مسعودؓ سے صحیح سند کے ساتھ حدیث موجود ہے آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا انّ لِلّٰہ ملائکۃ سیاحین فی الارض یبلغونی من امتی السلام اور یہ روایت واضح کرتی ہے کہ درود شریف آپؐ کو فرشتوں کے ذریعہ پہنچایا جاتا ہے اور مشکوٰۃ اور بیہقی میں حضرت ابو ہریرۃؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا من صلّی علیّ عند قبری سمعتہٗ ومن صلّی علیّ نائیًا اُبلغتہٗ اس روایت سے بھی معلوم ہوا کہ قبر مبارک کے قریب سے تو آپ براہِ راست درود شریف سنتے ہیں لیکن دور سے درود شریف آپ کو پہنچایا جاتا ہے اور نسائی میں حضرت اوسؓ بن اوس سے مرفوع روایت ہے کہ فان صلوٰتکم معروضۃ علیّ الحدیث یہ سب حدیثیں صریح ہیں عدم السماع من بعید میں اور ظاہر ہے کہ جلاء الافہام ان کتب کی برابر قوت میں نہیں ہو سکتی لہٰذا قوی کو ترجیح ہوگی (بوادر النوادر ص۲۷۲ محصلہ) ان احادیث پر ہم نے بحمد اللہ تعالیٰ تسکین الصدور میں روایۃً ودرایۃً سیر حاصل بحث کی ہے کہ یہ صحیح ہیں مؤلف مذکور نے حضرت تھانویؒ کی اس تحقیق کا ذکر تو کیا اشارۃً تک نہیں کیا کیونکہ پھر تو ان کے دجل وتلبیس کی قلعی کھل جاتی تھی۔ دوم حضرت تھانویؒ تحریر فرماتے ہیں کہ بعد تحریر جواب ہذا بلا توسطِ فکر قلب پر وارد ہوا کہ اصل حدیث میں صوتہٗ نہیں بلکہ صلوٰتہٗ ہے کاتب کی غلطی سے لام رہ گیا ہے اُمید ہے کہ اگر نسخ متعددہ دیکھے جائیں تو ان شاء اللہ تعالیٰ کسی نسخہ میں ضرور اسی طرح نکل آوے گا والغیب عند اللہ تعالیٰ (بوادر النوادر ص۲۷۳) حضرت تھانویؒ نے یہ جو کچھ فرمایا ہے بالکل درست اور صحیح ہے (نیل الاوطار ج ۳ ص۲۶۴) میں حضرت ابو الدرداءؓ کے

طرق میں طبرانی کے حوالہ سے یہ روایت یوں نقل کی ہے

وفی روایۃ للطبرانی لیس من عبد یصلی علیَّ الا بلغتنی صلوٰتہ قلنا وبعد وفاتک قال وبعد وفاتی (الحدیث)

طبرانی کی روایت میں ہے کہ کوئی بندہ نہیں جو مجھ پر درود پڑھتا ہے مگر مجھے اس کی صلوٰۃ پہنچتی ہے ہم (صحابہؓ) نے کہا آپؐ کی وفات کے بعد بھی صلوٰۃ پہنچے گی آپؐ نے فرمایا کہاں میری وفات کے بعد بھی۔

اس روایت میں حضرت ابوالدرداءؓ کی روایت میں بجائے صوتہ کے صلوٰتہ کے الفاظ موجود ہیں اور یہ پہنچانا بجز صحیح احادیث کے پیش نظر فرشتوں کے ذریعہ سے ہے دور سے براہ راست نہیں کما مرّ اور امام سخاویؒ حضرت ابوالدرداءؓ کی یہ روایت معجم کبیر للطبرانی کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں اور اس میں بعینہا یہی الفاظ نقل کرتے ہیں الا بلغتنی صلوٰتہ الحدیث اور آخر میں لکھتے ہیں قال العراقیؒ ان اسنادہ لا یصح (القول البدیع ص۱۱۹ طبع الہٰ آباد (الھند) اس سے معاملہ بالکل واضح ہو گیا کہ اصل روایت میں صلوٰتہ تھا مگر کتابت کی غلطی سے صوتہ بن گیا اور جلاء الافہام طبع مصر میں بھی کتابت کی غلطیاں موجود ہیں مثلاً ص۲۴۷ میں او کما قال کی جگہ او کمال قال ہے اور ص۲۹۴ میں آلہٗ امتہٗ کی جگہ ال امتہٗ ہے لہٰذا ایسی غلط روایت پر جب کہ وہ بھی بقول امام سخاویؒ صحیح نہیں ہے کس طرح نصوص قطعیہ اور احادیث صحیحہ اور فقہاء ملت کے صریح فتووں کے خلاف عقیدہ کی بنیاد رکھی جا سکتی ہے؟ اور کون دیانت دار ایسا کر سکتا ہے؟ مؤلف مذکور کا علمی اور اخلاقی فریضہ تھا کہ وہ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کے ان حوالوں کا بھی ذکر کرتے اور بن پڑتا تو جواب دیتے مگر وہ کہہ سکتے ہیں کہ ؎

میرے آگے بھی اشرف نے حوالے کر دیئے ظاہر مگر میں نے تو اپنا فائدہ اعراض میں دیکھا

مؤلف مذکور نے یہ عنوان قائم کیا ہے کہ صحابہ کرامؓ سے الصلوٰۃ والسلام علیک یارسول اللہ کا ثبوت، اور اس کے ثبوت کے لئے وہ لکھتے ہیں کہ خفاجی الحنفیؒ فرماتے ہیں کہ

والمنقول انھم کانوا یقولون فی تحیۃ الصلوٰۃ والسلام علیک یا رسول اللہ (نسیم الریاض ج ۳ ص۴۵۴)	منقول ہے کہ صحابہ کرامؓ حضور پر تحیہ پیش کرتے ہوئے کہتے تھے الصلوٰۃ والسلام علیک یارسول اللہ

ذکر بالجہر ص۲۱۲)

الجواب: پہلے ہم باحوالہ عرض کر چکے ہیں کہ اگر کوئی شخص آپؐ کو حاظر و ناظر نہ سمجھے اور یہ سمجھے کہ فرشتے آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو پہنچاتے ہیں تو الصلوٰۃ والسلام علیک یارسول اللہ کے مختصر الفاظ سے بھی درود شریف پڑھ سکتا ہے قبر مبارک کے قریب ہو تب بھی (کہ صحیح حدیث کے رُو سے آپ بنفس نفیس خود سنتے ہیں) اور دُور سے بھی (کہ احادیث صحیحہ کے پیش نظر فرشتے پہنچاتے ہیں کما مَرّ) اور علامہ سمہودیؒ کا واضح حوالہ اس پر عرض کیا جا چکا ہے لیکن مؤلف مذکور نے علامہ الخفاجیؒ کے حوالہ سے جو عبارت نقل کی ہے اور اس سے معہود الصلوٰۃ والسلام پر جو استدلال کیا ہے وہ ان کے دجل و تلبیس یا جہالت اور کم فہمی کا زندہ ثبوت ہے علامہ خفاجیؒ نے اس مقام پر خاص تصریح کے ساتھ یہ بحث کی ہے کہ نماز کے اندر التحیات میں حضرات صحابہ کرامؓ سے جہاں السلام علیک ایھا النبی الخ ثابت ہے وہاں ان سے یہ بھی منقول ہے کہ وہ نماز کے التحیات اور تشہد میں السلام علیک یارسول اللہ بھی پڑھتے تھے، بحث انہوں نے نماز کے اندر التحیات اور تشہد کی کی ہے اور الفاظ اس میں صرف السلام علیک یارسول اللہ ہیں مگر مؤلف مذکور نے اپنی جہالت کی وجہ سے

خارج از نماز اس سے الصلوٰۃ والسلام علیک یا رسول اللہ بنا ڈالا ہے علامہ خفاجی الحنفی رح کی اصل عبارت یہ ہے۔

والمنقول انھم کانوا یقولون فی تحیۃ الصلوٰۃ السلام علیک یارسول اللہ او نبی اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیک وسلم ونحوہ فما نعلموہ زائد علی التحیۃ فی الصلوٰۃ الخ	اور ان سے منقول یہ ہے کہ وہ نماز کے سلام (التحیات) میں السلام علیک یا رسول اللہ یا نبی اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیک وسلم اور اس کی مانند الفاظ کہتے تھے سو جو انھوں نے سیکھا وہ نماز کے تحیۃ پر زائد تھا الخ

(نسیم الریاض ج ۳ ص۴۵۴)

اور آگے نماز سے باہر کے سلام کی بحث امام ابن عبد البر رح کے حوالہ سے الگ کی ہے اور بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

قلت علم ھذا من اطباق العلماء والمحدثین من غیر نکیر علی ان المراد بھا فی الصلوٰۃ ولذا اوردت مذکورۃ فی التشھد فی کتبھم دون باب الادعیۃ اھ (ج ۳ ص۴۵۴)	میں کہتا ہوں کہ بغیر کسی نکیر کے علماء اور محدثین کے اجماع سے معلوم ہوا ہے کہ اس سے مراد نماز کے اندر سلام کہنا ہے اور اسی لئے یہ الفاظ ان کی کتابوں میں تشہد میں وارد ہوئے ہیں دعاؤں کے باب میں وارد نہیں ہوئے۔

الغرض یہ بات نماز کے اندر التحیات اور تشہد کے موقع پر سلام کہنے کی ہے اور اس میں سلام کے لفظ ہیں معہود الصلوٰۃ کے لفظ نہیں ہیں صلوٰۃ کے معنی یہاں نماز کے ہیں اور حرف واو بھی درمیان میں موجود نہیں ہے الفاظ یہ ہیں فی تحیۃ الصلوٰۃ السلام علیک یا رسول اللہ مگر ساون کے اندھے نے لفظ صلوٰۃ سے معہود صلوٰۃ سمجھ لی اور الصلوٰۃ اور السلام کے درمیان علامہ خفاجی رح کی عبارت میں تو حرف واو نہیں مگر مؤلف مذکور نے اپنی طرف سے حرفِ

واؤ بھی بڑھا دیا ہے اور معنی یہ کیا کہ صحابہ کرام حضور پر تحیہ پیش کرتے ہوئے کہتے تھے الصلوٰۃ والسلام علیك یا رسول اللہ بات کیا تھی اور مؤلف مذکور نے اپنی نادانی سے بنا کیا ڈالی ہے اور خیبر سے کم علمی اور بددیانتی حضرت مولانا تھانویؒ کی ثابت کر رہے ہیں جن کے علم و دیانت اور فہم و ذکاء کا سکہ دنیائے اسلام مانتی ہے اور یہ خدا تعالیٰ کا فضل و کرم ہے جو توحید و سنت اور اخلاص کی برکت سے حاصل ہوا ہے۔ ؎

مشامِ تیز سے ملتا ہے صحرا میں نشاں اس کا
ظن و تخمین سے ہاتھ آتا نہیں آہوئے تاتاری

باب سوم

بدعت کا شبہ

یہ عنوان قائم کر کے مؤلف مذکور نے لکھا ہے کہ نفلی عبادات کے لئے اپنے اجتہاد سے کوئی بھی وقت معین کیا جا سکتا ہے لیکن یہ تعیین شرعی نہیں ہوتی چنانچہ اذان سے پہلے اور بعد کے اوقات کو صلوٰۃ وسلام پڑھنے کے لئے خاص کر لیا جائے تو یہ امر دلائل شرعیہ کی روشنی میں جائز اور ثابت ہے دیکھئے نفلی روزہ ہر دن رکھا جا سکتا ہے، لیکن حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم ہمیشہ پیر کے دن روزہ رکھتے تھے مسلم (ج ۱ صـ ۳۶۸) میں ہے آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس دن میری ولادت ہوئی اور اس دن مجھ پر قرآن کریم نازل ہوا ہے اسی طرح آپ ہر ہفتہ مسجد قباء جاتے تھے اور حضرت ابن عمرؓ بھی ایسا ہی کرتے تھے (بخاری ج ۱ صـ ۱۵۹) حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ اس حدیث سے ثابت ہوا کہ بعض اعمال صالحہ کی ادائیگی کو بعض ایام صالحہ کے ساتھ خاص کر لینا اور اس پر عمل میں مداومت کرنا جائز ہے (فتح الباری ج ۳ صـ ۳۱۲) اور علامہ عینیؒ لکھتے ہیں کہ اس حدیث میں اس بات پر دلیل ہے کہ بعض ایام کو بعض عبادات کے ساتھ خاص کر لینا جائز ہے الخ (عمدۃ القاری ج ۷ صـ ۲۵۹) اور مولوی اشرف علی تھانوی اس حدیث کی تقریر میں لکھتے ہیں کہ ہر دو حدیث سے ثابت ہوا کہ کسی مقصود مباح یا کسی طاعت کے لئے

ین یوم اگر باعتقاد قربت نہ ہو بلکہ کسی مباح مصلحت کے لئے ہو جائز ہے
جیسے مدارس دینیہ میں اسباق کے لئے گھنٹے متعین ہوتے ہیں اور اگر باعتقاد
قربت ہو منہی عنہ ہے پس عرس میں جو تاریخ معین ہوتی ہے اگر اس تعیین کو
قربت نہ سمجھیں بلکہ اور کسی مصلحت سے یہ تعیین ہو مثلاً سہولت اجتماع تا کہ تداعی
کی صعوبت یا لبعض اوقات اس کی کراہت کے شبہ سے مامون رہیں الیٰ قولہ
بہر حال اگر ایسے مصالح سے یہ تعیین ہو تو فی نفسہ جائز ہے (بوادر النوادر ص ۴۵۱)
نفلی عبادات میں اپنے اجتہاد سے وقت معین کرنا درست ہے اور حضرت
بلال رضؓ کا عمل کہ وہ جب بھی رات یا دن کو وضو کرتے تو نماز پڑھتے اور آنحضرت
صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس کی تحسین فرمائی (محصلہ بخاری ج ۱ ص ۱۵۴) حافظ ابن
حجرؒ لکھتے ہیں کہ (نفلی) عبادات کے لئے اپنے اجتہاد سے وقت معین کرنا جائز
ہے الخ (فتح الباری ج ۳ ص ۲۷) حضرت کلثومؓ بن ہدم ہر رکعت میں سورۂ اخلاص
پڑھتے تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس سورت کی محبت نے
تم کو جنت میں داخل کر دیا (بخاری ج ۱ ص ۱۰۷) تو جو لوگ حضور صلی اللہ تعالیٰ
علیہ وسلم سے محبت کی وجہ سے اذان کے اول و آخر درود شریف پڑھتے ہوں
وہ کیونکر اس بشارت سے محروم ہوں گے حالانکہ انہوں نے درود شریف کو نہ
عبادت میں داخل کیا نہ اسے لازم کیا محض ذوق و شوق سے حضور کی محبت
میں اذان کے اول و آخر فصل کر کے خلاف لہجہ سے اس درود کو پڑھتے ہیں۔
(محصلہ ذکر بالجہر ص ۲۳۴ تا ص ۲۴۱)

الجواب۔ مؤلف مذکور نے یہ جو کچھ لکھا ہے سراسر باطل و مردود ہے
اولاً اس لئے کہ نفلی عبادت کے لئے بلا شبہ اپنی سہولت کے لئے وقت
مقرر کر لینا جائز ہے لیکن انفرادی طور پر نہ کہ اجتماعی رنگ میں اور اس کے لئے تداعی

اور اہتمام بھی ہرگز درست نہیں ہے اور نہ ان لوگوں پر نکیر درست ہے جو یہ کاروائی نہیں کرتے اور نہ ان کو حقارت کی نگاہ سے دیکھنا درست ہے اور نہ ہی یہ کاروائی کرنے والے کو اس پر ایسا اصرار ہی جائز ہے جس پر بحث و مباحثہ اور مناظرہ تک نوبت آئے آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اپنی ولادت اور بعثت کی خوشی میں پیر کا روزہ رکھا ہے لیکن حضرات صحابہ کرام رضؓ کو ہرگز دعوت نہیں دی اور نہ ان پر یہ کاروائی لازم قرار دی ہے اور نہ انہوں نے ایسا کیا ہے۔ نیز آپؐ بروز ہفتہ مسجد قبا تشریف لے جاتے تھے مگر اس کے لئے آپؐ نے حضرات صحابہ کرامؓ کو کوئی تلقین نہیں فرمائی یہی وجہ ہے کہ جمہور صحابہ کرامؓ ایسا نہیں کرتے تھے اور جو کرتے تھے مثلاً حضرت ابن عمر رضؓ وغیرہ تو وہ حضرات یہ کاروائی نہ کرنے والوں پر ہرگز کوئی نکیر نہیں کرتے تھے اور نہ اس کے لئے اوروں کو دعوت دیتے تھے اسی طرح حضرت بلال رضؓ کا تحیۃ الوضوء ادا کرنا اور حضرت کلثومؓ بن ہدم کا ہر رکعت میں ہر سورت کے ساتھ سورۂ اخلاص کا پڑھنا ان کا اپنے زعم سے اچھا عمل تھا اور آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی تحسین بھی فرمائی مگر دوسروں کے لئے یہ کاروائی لازم قرار نہیں دی گئی یہی وجہ ہے کہ ہر رکعت میں ہر سورت کے ساتھ سورۂ اخلاص کا پڑھنا صرف حضرت کلثومؓ بن ہدم پر ہی بندر ہا اور کسی نے ایسا نہیں کیا اگر یہ عمومی مسئلہ ہوتا تو حضرات صحابہ کرامؓ جو ہر نیکی پر حریص تھے یہ کارِ خیر ہرگز نہ چھوڑتے اسی طرح تحیۃ الوضوء ایک ذاتِ سبب نیکی ہے مگر یہ انفرادی اور اختیاری ہے کوئی پڑھے تو ثواب کا مستحق ہے نہ پڑھے تو اس پر شرعاً کوئی ملامت درست نہیں اور ایسی ثابت شدہ عبادت پر مداومت بھی درست ہے مگر جس چیز کا شرعاً ثبوت ہی نہیں، اس پر مداومت کا کیا معنی؟ جیسے اذانوں سے قبل یا بعد بآواز بلند صلوٰۃ وسلام۔

الغرض اپنی سہولت کے لئے انفرادی طور پر ثابت شدہ نیکی کے لئے وقت مقرر کر لینا درست ہے اور اس کا کوئی بھی منکر نہیں ہے حافظ ابن حجرؒ اور علّامہ عینیؒ وغیرہ کی عبارات کا یہی مطلب اور یہی مفاد ہے اس تعیین سے ایسی تعیین ہرگز مراد نہیں جس میں تداعی اور اہتمام بھی شامل ہو اور نہ کرنے والوں پر ملامت روا ہو اور پھر انفرادی تعیین کو اجتماعی رنگ دیا جائے اور جس میں شرعاً جہر اور تشہیر مطلوب نہیں اس کی تشہیر کی جائے اور عوام کی نماز نیند اور آرام وغیرہ کا قطعاً خیال نہ کیا جائے محض پیٹ کے دھندے کے لئے بدعت کو عین اسلام بنا لیا جائے اور ایسا نہ کرنے والوں کو خطابات سے نوازا جائے جیسا کہ اہل بدعت کا وتیرہ ہے اور ان دونوں باتوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے کما لا یخفٰی۔

وثانیاً مؤلف مذکور کا یہ کہنا کہ اذان سے پہلے اور بعد کے اوقات کو صلوٰۃ وسلام پڑھنے کے لئے خاص کر لیا جائے تو یہ امر دلائل شرعیہ کی روشنی میں جائز ہے الخ سراسر مردود ہے دلائل شرعیہ جو مؤلف مذکور نے پیش کئے ہیں وہ اس مسئلہ سے بالکل غیر متعلق ہیں اور عدم جواز کے دلائل بفضلہ تعالیٰ ہم نے حکم الذکر بالجہر میں عرض کر دیئے ہیں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم یہاں بریلوی حضرات کے معتبر اور وقیع ماہنامہ انوار الصوفیہ قصور (جس کے مؤسس حضرت پیر جماعت علی شاہ صاحب ہیں) سے ایک سوال اور اس کا جواب عرض کر دیں جو درج ذیل ہے

سوال: آج کل ہم اہل السنت والجماعت کی تمام مساجد میں باآواز بلند اذان سے قبل صلوٰۃ وسلام چند بار پڑھتے ہیں اور بعض مؤذنین صلوٰۃ وسلام سے بھی پہلے اعوذ باللہ اور بسم اللہ اور آیت اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ یا کوئی اور آیت پڑھتے ہیں اور پھر صلوٰۃ وسلام اور پھر اذان پڑھتے

ہیں کیا یہ جائز ہے ؟

جواب: اذان سے قبل اعوذ پڑھنا مشروع نہیں ہے اس کا حکم قرآن شریف کی تلاوت کے ساتھ مخصوص ہے یعنی جب قرآن شریف پڑھنا چاہو تو اعوذ پڑھ لو اس کے سوا کسی چیز سے پہلے پڑھنے کا حکم نہیں بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ہر نیک کام کے اول پڑھنا باعث برکت ہے لیکن اونچی آواز سے اور مزید برآں لاؤڈ سپیکر میں پڑھنا فضول ہے آہستہ سے پڑھنا کافی ہے قرونِ اولیٰ میں بلکہ پاکستان کے معرض وجود میں آنے سے قبل کہیں بھی اذان کو اونچی آواز سے بسم اللہ پڑھ کر شروع کرنا معہود نہیں ہے ایسے ہی اونچی آواز سے بالالتزام صلوٰۃ وسلام اذان سے قبل پڑھنا اور اس کو عادت بنانا بھی مشروع نہیں ہے دراصل یہ زوائد وہابیوں دیوبندیوں کی ضد سے یا نعت خوان قسم کے مؤذنین نے پیدا کئے ہیں ازمنۂ سابقہ میں سب قارئین جانتے ہیں کہ اذان اس زوائد سے خالی ہوتی تھی اگر ہمارے علماء عوام کی تائید میں کہ اب وہ اس راستہ پر چل پڑے ہیں غور وفکر سے اس کو جائز ثابت کر بھی دیں تو صرف جائز ہی ہوگا۔ مستحب یا مندوب یا افضل نہیں ہوگا باقی رہ گئی یہ بات کہ اس پر ثواب بھی ہوگا یہ بات تب ہو کہ وہ مستحب ہو۔ اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خاں صاحب بریلوی رحؒ سے اس کی بابت پوچھا گیا تو انہوں نے لکھا کہ اذان کے بعد جب جماعت کا وقت قریب ہو کسی شخص یا مؤذن کا بطور تثویب کے سلام وصلوٰۃ پڑھنا بہتر ہے یعنی اذان کے بعد صلوٰۃ وسلام پڑھنے کی وجہ ہو سکتی ہے مگر اذان کے اوّل کوئی وجہ وجیہہ بلا نکیر نہیں ہے اور اس رسم کو جو اسلام میں معہود نہیں تھی جہلاء بڑھاتے چلے جا رہے ہیں اور علماء کرام خاموش ہیں پتہ نہیں کیوں ؟ یہ عظیم المیہ ہے بلفظہٖ (ماہنامہ انوار الصوفیہ ماہ جنوری ۱۹۷۸ء شمارہ ۴ ایڈیٹر علامہ غلام رسول گوہر)

اس سے معلوم ہوا کہ اذان سے قبل اور بعد قرون اولیٰ میں صلوٰۃ وسلام ہرگز نہیں ہوتی تھی اور یہ مستحب بھی نہیں ہے جہلا اس معاملہ میں پیش پیش ہیں مگر علماء کرام خاموش ہیں نہ معلوم کیوں خاموش ہیں؟ اور مؤلف مذکور کو بھی اس کا اقرار ہے چنانچہ وہ خود لکھتے ہیں کہ جو لوگ اذان سے قبل اور بعد درود شریف پڑھتے ہیں وہ نہ تو اس کو عبادت سمجھتے ہیں اور نہ لازم محض حضور کی محبت کے ذوق سے پڑھتے ہیں (محصلہ) لیکن مؤلف مذکور کا یہ کہنا کہ لوگ اس کو لازم نہیں سمجھتے بالکل بے بنیاد ہے کیونکہ ان کی بعض مساجد میں لاؤڈ سپیکر پر اذان ہو یا نہ ہو صلوٰۃ وسلام کا ناغہ نہیں ہوتا لازم اور کیا چیز ہوتی ہے؟ البتہ بعض اس کاروائی کو عبادت نہیں سمجھتے کیونکہ وہ محض دیوبندیوں اور وہابیوں کی ضد سے پڑھتے ہیں خدا تعالیٰ کی رضا کے لئے ہرگز نہیں پڑھتے اور ظاہر بات ہے کہ مخلوق کی ضد کا نام عبادت نہیں بلکہ شرارت ہے اور یہ بات مؤلف مذکور کی بالکل درست ہے کہ پڑھنے والے اس کو عبادت نہیں سمجھتے۔

و ثالثاً مؤلف مذکور نے حضرت تھانویؒ کی عبارت تو فی نفسہ جائز ہے تک تو نقل کر دی ہے اور آگے ان کی ضروری عبارت ترک کر دی ہے جو علمی طور پر خیانت مجرمانہ ہے تو فی نفسہ جائز ہے سے آگے عبارت یہ ہے لیکن اگر اور کوئی عارض موجب منع اس میں منضم ہو جاوے مثلاً سماع خلاف شرائط یا اختلاط امارد ونساء (یعنی بے ریش لڑکوں اور عورتوں سے اختلاط۔ صفدر) یا مجمع کے جمع کرنے کا اہتمام خصوص فساق وفجار کے شریک کرنے کا اہتمام یا شرکت کے بعد بلاضرورت ان کا احترام یا احتمال فساد عقیدۂ عوام تو ان عوارض سے پھر وہ مباح بھی ممنوع ہو جاوے گا اور قطعاً وہ عرس واجب الترک ہو جاوے گا جیسا اس زمانہ میں اکثر اعراس کی حالت ہو گئی ہے پس قدماء مشائخ سے جو اعراس منقول ہیں

نفل صحیح ہو ان میں کوئی امر منکر ثابت نہیں پس اُن کے فعل میں کوئی اشکال نہیں اس وقت کے اعراس کو اُن پر قیاس کرنے کی اصلاً گنجائش نہیں کہ اس میں علاوہ فساد اعتقادی کے التزام و اہتمام ایسا ہوتا ہے کہ وہ عید منہی عنہ ہو جاتی ہے۔ جس کی نسبت نسائی کی حدیث ہے۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا تجعلوا قبری عیداً وصلوا علیّ فان صلوٰتکم تبلغنی حیث کنتم (فرمایا جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے کہ میری قبر کو عید نہ بنانا اور مجھ پر درود پڑھنا اس لئے کہ تمہارا درود میرے پاس پہنچایا جائیگا جہاں کہیں بھی تم ہو گے)

بر نظر بر تھی تحقیقِ حکمِ عرس میں الخ (بوادر النوادر ص ۵۸ ج ۲)

قارئین کرام! ملاحظہ فرمائیں کہ لیکن سے پہلے کی عبارت (جو مستثنیٰ منہ ہے) مؤلف مذکور نے ذکر کر دی ہے مگر مستثنیٰ کو ترک کر دیا ہے جو عملی طور پر انتہائی خیانت ہے اور یہ ساری اہم اور ضروری عبارت مؤلف مذکور کی خیانت کی بھینٹ چڑھ گئی ہے مگر وہ الٹا دوسروں کو محرف اور خائن ثابت کرنے کے درپے ہیں۔

فوا اسفاً

باب چہارم

ذکر بالجہر اور حضرت امام ابو حنیفہؒ

ہم نے حکم الذکر بالجہر میں فقہاء احناف رحمہم اللہ کے صریح اور واضح اقوال اور عبارات سے حضرت امام ابو حنیفہؒ کا مسلک عرض کیا ہے کہ جن مواقع میں شریعت سے جہراً ذکر اور دعا ثابت نہیں وہ ایسے مواقع میں اس کو بدعت اور مکروہ کہتے ہیں مؤلف مذکور اپنی عادت کے مطابق ان تمام واضح حوالوں کو میٹھا دودھ سمجھ کر پی گئے ہیں اور ان صریح حوالوں سے جو مخلص تلاش کیا ہے وہ ان کی عبارت میں یہ ہے۔ امام اعظمؒ کا مسلک جواز جہر علی الاطلاق ہے۔

الجواب۔ جس طرح بعض لوگوں نے امام اعظمؒ کے بارے میں یہ لکھا ہے کہ وہ علی العموم والاطلاق ذکر بالجہر کے قائل نہیں ہیں اسی طرح بعض لوگوں نے اس کے برعکس یہ بھی لکھا ہے کہ امام اعظمؒ بالعموم ذکر بالجہر کے قائل ہیں۔ چنانچہ علامہ آلوسیؒ لکھتے ہیں (ہم نے اختصاراً عربی عبارت ترک کر دی ہے ترجمہ مؤلف مذکور ہی کا ہے۔ صفدر) امام نوویؒ نے جس چیز پر اپنے فتاوی میں تصریح کی ہے وہ یہ ہے کہ جب کوئی مانع شرعی نہ ہو تو جہر بالذکر نہ صرف مستحسن ہے بلکہ وہ اخفاء سے افضل ہے جس طرح امام شافعیؒ کا مذہب ہے اور یہی امام احمدؒ کا مسلک ہے اور حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے فتح الباری میں امام مالکؒ کا بھی یہی قول نقل

کیا ہے اور قاضی خان نے بھی مسائل (کیفیت ۔صفدر) قرأت کے بیان میں اپنے فتاوای میں یہی قول نقل کیا ہے البتہ باب غسل المیت میں کہا ہے ذکر بالجہر مکروہ ہے اور ان کا یہ قول صرف جنازہ کے ساتھ ذکر کرنے کے ساتھ مخصوص ہے جیسا کہ شافعیہ کا مذہب ہے اور انہوں نے مطلقاً ذکر بالجہر سے منع نہیں کیا جیسا کہ صاحب بحر الرائق نے سمجھا ہے اور عید الفطر کی تکبیرات بھی عید الاضحے کی تکبیرات کی طرح ہیں یہی امام ابو یوسف اور امام محمدؒ کا مسلک ہے اور امام اعظمؒ سے بھی ایک روایت یہی ہے بلکہ مسند امام اعظمؒ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ذکر بالجہر کو مطلقاً مستحب قرار دیتے ہیں (روح المعانی ج ۱۶ ص ۱۶۲ و ص ۱۶۳) اسی طرح علامہ ابن عابدین شامیؒ تحریر فرماتے ہیں (عربی عبارت ہم نے ترک کر دی ہے ترجمہ مؤلف مذکور کا ہے ۔صفدر) عید الفطر کے دن امام صاحبؒ کے نزدیک تکبیرات جہراً نہیں پڑھی جائیں گی اور صاحبینؒ کے نزدیک جہراً پڑھی جائیں گی (وھو روایۃ عنہ۔ یہ عربی عبارت مؤلف مذکور نے نقل کی ہے لیکن ترجمہ قصداً یا سہواً چھوڑ دیا ہے۔ اور امام صاحبؒ سے یہ بھی ایک روایت ہے ۔صفدر) اور یہ اختلاف صرف افضلیت میں ہے اور کراہت کسی جانب میں نہیں ہے (شامی ج ۱ ص ۷۷۸) علامہ آلوسیؒ اور علامہ شامیؒ کی ان تصریحات سے ثابت ہو گیا کہ ایک روایت امام صاحبؒ سے بھی عید الفطر کے دن تکبیرات میں جہر کی ہے بلکہ علامہ آلوسیؒ فرماتے ہیں کہ مسند امام اعظم سے ظاہر ہوتا ہے کہ امام اعظمؒ مطلقاً ذکر بالجہر کے استحباب کے قائل ہیں اور یہ کہ جس روایت میں امام صاحبؒ کا جہر میں صاحبینؒ سے اختلاف ہے وہ اختلاف صرف افضلیت میں ہے کراہت اور بدعت کا اختلاف نہیں ہے پس سرفراز صاحب نے جن بعض فقہاء سے جہر کے بارے میں امام صاحبؒ کے مذہب پر کراہت اور بدعت

کے اقوال نقل کئے ہیں وہ صحیح نہیں ہیں الخ (ذکر بالجہر ص۱۶۲ تا ص۱۶۴)

الجواب: مؤلف مذکور نے جس بھولے پن اور سادگی کا روپ دھارا ہے وہ طلبہ کے لئے قابل دید ہے غالباً ایسے ہی موقع کے لئے کہنے والے نے کہا ہے اور کیا ہی خوب کہا ہے۔

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

مؤلف مذکور کو معلوم ہونا چاہیئے کہ ان کا دعویٰ یہ ہے کہ امام اعظمؒ بالعموم ذکر بالجہر کے قائل ہیں۔ یہ الفاظ صراحت سے یہ ثابت کرتے ہیں کہ امام صاحبؒ کا مسلک مذہب اور فتویٰ یہ ہے لیکن علامہ آلوسیؒ اور علامہ شامیؒ کے حوالوں سے تو صرف یہ ثابت ہو رہا ہے کہ امام صاحبؒ کی ایک روایت یہ ہے۔ (روایۃ عن ابی حنیفہؒ۔ وھو روایۃ عنہ) اور مبتدی طالب علم بھی یہ جانتے ہیں روایۃ عنہ سے مسلک اور مذہب ثابت نہیں ہوتا (دیکھئے مقدمہ عمدۃ الرعایہ ص۱۰ وغیرہ) اور پھر امام صاحبؒ اور صاحبینؒ کا یہ اختلاف بہاں تکبیرات عید الفطر کے جزوی مسئلہ میں ہے اور ہم نے حکم الذکر بالجہر ص۹۵ تا ص۹۹ اس مسئلہ پر علامہ شامیؒ وغیرہ کے حوالہ سے بحث کی ہے مگر مؤلف مذکور نے اس کا ذکر تک نہیں کیا امام صاحبؒ اس موقع پر نہیں بلکہ ہر ایسے موقع پر ذکر بالجہر کو بدعت کہتے ہیں جہاں شرعاً ثابت نہیں اور ان کا قول مستثنیٰ مواقع کے علاوہ عام ہے مؤلف مذکور کے جواب کے لئے تو اتنی ہی بات کافی ہے جو عرض کر دی گئی ہے کہ روایۃ عنہ سے مذہب اور مسلک ثابت نہیں ہوتا مگر ہم بعون اللہ تعالیٰ اس کی مزید تشریح کرتے ہیں تاکہ طلبۂ علم کو اس سے فائدہ ہو۔

مؤلف مذکور نے علامہ آلوسیؒ سے بل فی مسندہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

ما ظاھرہ استحباب الجھر بالذکر مطلقاً تک عبارت نقل کی ہے کیونکہ اس سے بزعم ان کے ان کی گاڑی چلتی تھی اور لفظ مطلقاً کے بعد یہ عبارت بھی ہے جس کو کھا گئے ہیں۔

نعم قال ابن نجیم فی البحر نقلاً عن المحقق ابن الھمام فی فتح القدیر ما نصہ قال ابو حنیفۃ رح رفع الصوت بالذکر بدعۃ مخالف للامر من قولہ تعالیٰ فاذکر ربک فی نفسک الآیۃ فیقتصر علیٰ مورد الشرع وقد ورد بہ فی الاضحیٰ وھو قولہ سبحانہ تعالیٰ واذکروا اللہ فی ایام معدودات الخ (روح المعانی ج ۱۶ ص ۱۶۳)

ہاں ابن نجیم رح نے البحر الرائق میں محقق ابن ہمام رح کی فتح القدیر سے صراحت کے ساتھ یہ نقل کیا ہے کہ امام ابو حنیفہ رح فرماتے ہیں کہ بلند آواز سے ذکر کرنا بدعت ہے اور اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِي نَفْسِكَ الآیۃ میں امر کے مخالف ہے لہذا ذکر بالجہر اس مورد پر بند رہے گا جو شریعت سے ثابت ہے اور عید الاضحیٰ میں وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِي أَيَّامٍ مَّعْدُودَاتٍ میں اس کا حکم وارد ہوا ہے الخ

اس کے بعد علامہ آلوسی رح نے امام سیوطی رح سے آیت کے چند جواب بھی نقل کئے ہیں اور ہر ادنیٰ طالب علم بھی بخوبی سمجھ سکتا ہے کہ علامہ آلوسی رح نے اس عبارت میں امام صاحب رح کا مسلک بیان کیا ہے اور اس کے خلاف جو روایت ان سے منقول ہے اس عبارت میں اس کا عالمانہ انداز میں جواب دیا ہے۔ یہ کتنی اہم اور ضروری عبارت ہے جس سے امام صاحب رح کے مسلک پر صراحت سے روشنی پڑتی ہے مگر یہ مؤلف مذکور کے مفاد پرستی کی نذر ہو گئی ہے اور انہوں نے اپنی کتاب ذکر بالجہر میں جا بجا اس کا رونا رویا ہے کہ مؤلف حکم الذکر بالجہر عبارتوں میں قطع و برید کرتا ہے۔

فتاویٰ قاضی خاں کا حوالہ

علامہ آلوسیؒ نے امام قاضی خانؒ کے مسائل کیفیۃ القرأۃ کے حوالہ سے جو بات تحریر فرمائی ہے گو اس کا تعلق امام ابوحنیفہؒ کے مسلک سے نہیں ہے وہ صرف امام قاضی خانؒ کا اپنا فتوٰی ہے مگر اس کو بھی دیکھنا چاہیئے کہ وہ ہے کیا؟ امام قاضی خانؒ تحریر فرماتے ہیں کہ۔

واما قرأۃ القرأن فی الحمام ان لم یکن فیہ احد مکشوف العورۃ و کان الحمام طاھرًا لا بأس بان یرفع صوتہ بالقرأۃ وان لم یکن کذٰلك فان قرأ فی نفسہ لا بأس بہ ولا بأس بالتسبیح والتھلیل وان رفع صوتہ بہ الخ (فتاوٰی قاضیخان ج ۱ ص۷۸ ، مسائل کیفیۃ القرأۃ طبع نولکشور)	اگر حمام میں کسی کے پردے کی جگہ ننگی نہ ہو اور حمام پاک ہو تو بلند آواز سے قرآن پاک پڑھنے میں کوئی حرج نہیں ہے اگر ایسا نہ ہو تو دل میں پڑھ لیتے ہیں کچھ مضائقہ نہیں اور کوئی حرج نہیں کہ بلند آواز سے سبحن اللہ اور لا الٰہ الا اللہ پڑھے۔

ظاہر امر ہے کہ حمام ذکر خانہ تو ہے نہیں کہ اس میں کوئی اجتماعی یا انفرادی صورت میں ذکر کرنا ہو وہاں اگر کوئی بلند یا آہستہ آواز سے قرآن کریم کی کوئی آیت پڑھتا ہے یا سبحان اللہ اور لا الٰہ الا اللہ وغیرہ پڑھتا ہے تو وہ صرف دین کے ساتھ اپنا تعلق ظاہر کرنے کے لئے یا کوئی اچھی چیز دیکھ کر اظہار خوشی کے لئے یا کوئی بری چیز دیکھ کر اظہار ناراضگی یا تبلیغ کی خاطر کرتا ہے ایسے موقع پر قرآن کریم کی کوئی آیت کریمہ یا تسبیح وتہلیل بلند آواز سے پڑھنے سے علی الاطلاق ذکر میں رفع الصوت پر استدلال کیونکر صحیح ہو سکتا ہے؟ اور دلائل واضحہ اور روشن حوالوں سے ثابت ہے کہ جہاں قرأت قرآن یا ذکر سے کسی کے آرام اور کام میں

خلل پڑتا ہو تو وہاں جہر سے پڑھنے والا گنہگار ہوگا چنانچہ خود امام قاضی خانؒ اسی صفحہ میں آگے تحریر فرماتے ہیں۔

رجل یقرأ القرآن وبجنبہ رجل یکتب الفقہ لا یمکن ان یستمع کان الاثم علی القاری لانہ قرأ فی موضع یشتغل الناس باعمالھم ولا شئ علی الکاتب (فتاوٰی قاضی خان ج ۱ ص ۷۸)

ایک شخص قرآن کریم پڑھتا ہے اور اس کے پہلو میں کوئی شخص فقہ (کے مسائل) لکھتا ہے اس کے لئے اپنا کام جاری رکھتے ہوئے قرآن کریم سننا ممکن نہیں تو قرآن کریم پڑھنے والا گنہگار ہوگا کیونکہ وہ ایسی جگہ پڑھ رہا ہے جہاں لوگ اپنے کاموں میں مشغول ہیں اور فقہ لکھنے والے پر کوئی گناہ نہیں ہے۔

اس سے صاف طور پر معلوم ہوا کہ جہاں لوگوں کے کاموں میں خلل پڑتا ہو وہاں بلند آواز کے ساتھ قرآن کریم پڑھنے والا اور ذکر کرنے والا گنہگار ہوگا اور نزاع بھی صرف اسی حصہ میں ہے تنہائی میں یا تعلیماً ذکر بالجہر کا کوئی منکر نہیں اور آج کل اہل بدعت لاؤڈ سپیکر پر دن رات عوام الناس کے کان کھائے جا رہے ہیں نام تلاوت اور ذکر کا ہوتا ہے مگر حقیقت میں گروہ بندی اور شوقِ بدعت اور نفرت از سنت اس کا محرک اور سبب ہوتا ہے۔

مسندِ امام اعظمؒ کا حوالہ

کاش کہ علامہ آلوسیؒ مسندِ امام اعظمؒ کی اس حدیث کی نشاندھی کرتے جس سے ان کے خیال سے نظر بظاہر ذکر بالجہر کا استحباب ثابت ہوتا ہے تاکہ اس پر غور کیا جا سکتا، ہماری ناقص دانست کے مطابق ان کے پیش نظر وہ روایت ہے جو ابو حنیفہ عن علی بن الاقمر عن الاغر عن النبی صلی اللہ تعالٰی علیہ وآلہ وسلم سے یوں مروی ہے۔

انہ مر بقوم یذکرون اللہ تعالیٰ فقال انتم من الذین امرت ان اصبر نفسی معھم وما جلس قوم عدتکم من الناس یذکرون اللہ تعالیٰ الاحفتھم الملٰئکۃ باجنحتھا وغشیتھم الرحمۃ وذکرھم اللہ تعالیٰ فیمن عندہٗ۔

(مسند امام اعظم ج ۱ ص ۱۰۲)

کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک قوم کے پاس سے گزرے جو اللہ تعالیٰ کا ذکر کر رہی تھی آپ نے فرمایا کہ تم وہ لوگ ہو کہ مجھے ان کے ساتھ رہنے کا حکم دیا گیا ہے اور تمہاری گنتی کے لوگ جب بھی کسی مجلس میں بیٹھتے ہیں جس میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کریں تو ان کو فرشتے اپنے پروں سے احاطہ کر لیتے ہیں اور رحمت ان پر چھا جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ ان کا ذکر اپنے ہاں کی مخلوق (یعنی ملائکہ المقربین) میں کرتا ہے

مگر اس روایت میں جہر کا کوئی لفظ موجود نہیں ہے محض ذاکرین کا ذکر ہے اسی لئے علامہ آلوسیؒ ما ظاہرہ کا جملہ بولتے ہیں یعنی جس سے ظاہر ہوتا ہے علاوہ ازیں یہ بات بھی پیشِ نظر رہے کہ اس اجتماع سے برائے ذکر اجتماع مراد نہیں بلکہ برائے تعلیم اور درس و تدریس اجتماع مراد ہے چنانچہ حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ

عن النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ والہ وسلم قال ما من قوم یجتمعون فی بیت من بیوت اللہ یتعلمون القرآن و یتدارسونہ بینھم الاحفتھم الملٰئکۃ وغشیتھم الرحمۃ ونزلت علیھم السکینۃ الحدیث (جامع بیان العلم وفضلہ ج ۱ ص ۱۳)

آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ کوئی قوم نہیں جو اللہ تعالیٰ کے گھروں میں سے کسی گھر میں جمع ہو کر قرآن کریم کی تعلیم دے اور آپس میں اس کو پڑھتی پڑھاتی ہو مگر ان کو فرشتے گھیر لیتے ہیں اور ان پر رحمت چھا جاتی ہے اور ان پر سکینہ نازل ہوتی ہے

الغرض یہ حدیث اس امر کی واضح دلیل ہے کہ اس سے تعلیمی اجتماع اور علمی مجلس مراد ہے نہ کہ معہود مجلس ذکر۔ الحاوی للفتاوی اور امداد الفتاوی وغیرہ میں جن احادیث سے ذکر کی مجلس ثابت ہوتی ہے اُن سے بھی تعلیمی اور تدریسی مجلس مراد ہے۔

باب پنجم

حدیث خیر الذکر الخفی

یہ حدیث ہم نے کتب حدیث کے حوالوں کے ساتھ نقل کر کے امام سیوطیؒ اور علامہ عزیزیؒ سے اس کی با حوالہ تصحیح نقل کی ہے اور اس حدیث سے جو کچھ ثابت ہے اس کی روشنی میں ہم نے جو کچھ کہا ہے وہ بھی اصل کتاب ہی میں ملاحظہ کریں مگر مؤلف مذکور نے ہماری عبارت کی طرف قطعاً کوئی توجہ نہیں کی انہوں نے اس پر گرفت کرتے ہوئے جو کچھ کہا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ (۱) یہ حدیث ضعیف ہے اس لئے کہ اس کی سند میں ایک راوی ہے جس کا نام اسامہ بن زید ہے اگر یہ عدوی ہے تب ضعیف ہے اور اگر لیثی ہے تب ضعیف ہے (تہذیب ج ۱ ص۲۰۸ و ص۲۱۰) مانعین بزعم خویش اس روایت کو اصل قرار دے کر ذکر بالجہر کو مکروہ اور بدعت قرار دیتے ہیں۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔

(۲) مولانا عبدالحیؒ لکھنوی لکھتے ہیں کہ اس حدیث کا جواب یہ ہے کہ اس حدیث سے جہر کی ممنوعیت لازم نہیں آتی بلکہ یہ آہستہ ذکر کی فضیلت کو لازم کرتی ہے اور اس میں کوئی شک نہیں الخ پھر آگے مولانا عبدالحی صاحبؒ نے امام سیوطیؒ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ حدیث حیاتی خیر لکم ومماتی خیر لکم میں خیر شر کے مقابلہ میں نہیں بلکہ یہاں لفظ خیر آخیر کے معنی میں ہے اس لحاظ سے مطلب یہ ہوگا

کہ آہستہ ذکر میں بلند آواز سے ذکر کی بہ نسبت زیادہ خیر ہے اور ذکر بالجہر میں نسبتاً کم خیر ہے نہ یہ کہ ذکر بالجہر شر ہے جیسا کہ مانعین نے سمجھا ہے الخ (محصلہ سباحتہ الفکر فی الجہر بالذکر صلا و ملا لمولانا عبدالحیؒ۔ ذکر بالجہر ص ۱۵۱ تا ص ۱۵۵)

الجواب: مؤلف مذکور کے لئے مناسب تھا کہ ہم نے یہ حدیث نقل کر کے اس سے جو کچھ ثابت کیا ہے اس کو ضرور بیان کرتے مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا کیونکہ پھر تو ان کے جواب کی گاڑی رک جاتی تھی بہر حال اس کو قارئین کرام خود ملاحظہ کریں اور ترتیب وار جواب سنیں۔

(۱) ہم نے دو بزرگوں کی باحوالہ تصحیح نقل کی ہے اس کی موجودگی میں ہم بلاوجہ معاملہ کو طول نہیں دینا چاہتے صرف اتنا ہی عرض کرتے ہیں کہ یہ آپ کے بیان کردہ دو راویوں میں سے کوئی ایک ہو یا ان کے علاوہ کوئی اور ہو بیقین جانئے کہ ابراہیم بن ابی یحیٰی کی طرح کذاب تو ان میں کوئی بھی نہیں ہوگا بعض محدثین کرامؒ نے ان کی توثیق اور بعض نے تضعیف کی ہوگی اور ایسا مختلف فیہ راوی قابل برداشت ہوتا ہے اور اس کی حدیث حسن درجہ سے کم نہیں ہوتی ان دو بزرگوں کے علاوہ علامہ آلوسیؒ بھی اس حدیث کی تصحیح کرتے ہیں۔

وخیر خیر الرزق او العیش ما یکفی صحیح وعزاہ السیوطی الی الامام احمد وابن حبان والبیہقی عن سعدؓ بن ابی وقاص وعزاہ ابو الفتح فی سلاح المؤمن الی ابی عوانۃ فی مسندہ الصحیح ایضاً وھو محمول علی ما کان فی موضع یخاف فیہ	اور حدیث خیر الرزق یا العیش صحیح ہے اور امام سیوطیؒ نے امام احمدؒ امام ابن حبانؒ اور امام بیہقیؒ کی طرف منسوب کیا ہے کہ انہوں نے حضرت سعدؓ بن ابی وقاص سے یہ روایت نقل کی ہے اور امام ابو الفتحؒ نے (اپنی کتاب) سلاح المومن میں صحیح ابو عوانہ کی طرف بھی منسوب کی ہے اور یہ ایسی جگہ پر محمول ہے

للرياء او الاعجاب او غيرهما وقد صح
ايضًا انه عليه الصلوٰة والسلام
جهر بالدعاء و بالمواعظ ولكن
قال غير واحد من الاجلة ان
اخفاء الدعاء افضل وحد الجهر على
ما ذكره ابن حجر الهيتمي في المنهج
القويم ان يكون بحيث يسمع
غيره والاسرار بحيث يسمع
نفسه وعند الحنفية في رواية
ادنى الجهر اسماع نفسه وادنى
المخافتة تصحيح الحروف وهو
قول الكرخيؒ وفي كتاب الامام محمد
اشارة اليه والاصح كما في المحيط
قول الشيخين الهندواني والفضلي
وهو الذي عليه الاكثر ان ادنى الجهر
اسماع غيره وادنى المخافتة اسماع
نفسه الخ (روح المعانی ج ۱۶۲ ص ۱۶۳ و ص ۱۶۴)

جہاں ریاء یا خود پسندی یا ان کے سوا (مثلاً
کسی کی نماز، نیند، مطالعہ وغیرہ میں خلل) کا
خطرہ ہو اور آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم
سے بلند آواز سے دعا اور وعظ و نصیحت بھی
ثابت ہے لیکن بیشمار بڑے بڑے بزرگ
یہ فرماتے ہیں کہ آہستہ دعا افضل ہے اور
جہر کی حد جیسا کہ حافظ ابن حجر مکیؒ نے (اپنی
کتاب) منہج القویم میں ذکر کی ہے یہ ہے
کہ غیر کو سنا سکے اور سِرّ کی حد یہ ہے کہ خود
اپنے نفس کو سنا سکے اور احناف کی ایک
روایت میں یہ ہے کہ ادنیٰ جہر یہ ہے کہ خود
اپنے نفس کو سنائے اور ادنیٰ سِرّ یہ ہے کہ
حروف کی تصحیح کرے اور امام کرخیؒ کا یہی
قول ہے اور امام محمدؒ کی کتاب میں بھی اسی
کی طرف اشارہ ہے اور صحیح جس پر اکثر احناف
ہیں امام ہندوانیؒ اور امام فضلیؒ کا وہ قول ہے
جو محیط میں درج ہے کہ ادنیٰ جہر غیر کو سنانا
اور ادنیٰ سِرّ اپنے نفس کو سنانا ہے۔

علامہ آلوسیؒ کی اس عبارت سے حدیث مذکور کے صحیح ہونے کے
علاوہ بڑے بڑے اکابر احناف کا یہ مسلک ثابت ہوا کہ افضل دعا میں یہی
ہے کہ آہستہ ہو اور ادنیٰ جہر اور ادنیٰ مخافتت (سِرّ) کا مطلب اور صحیح قول بھی

اس سے واضح ہو گیا ہے اور جہاں آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے دعا میں جہر ثابت ہے وہ تعلیم کی خاطر ہے جیسا کہ اس کے بارے میں ہم نے حوالے درج کئے ہیں اور وعظ و تقریر کا بلند آواز سے ہونا ہی مطلوب ہے اور اس کے متعلق بھی کتاب میں حوالے دیئے گئے ہیں اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ یاد رہے کہ مانعین نے اس روایت سے ذکر بالجہر کے مکروہ اور بدعت ہونے پر استدلال نہیں کیا جیسا کہ مؤلف مذکور کا بے بنیاد دعوٰی ہے اس روایت سے مانعین نے صرف آہستہ ذکر کا بہ نسبت جہر کے افضل ہونا ثابت کیا ہے اور اس کا اقرار خود مؤلف مذکور کو بھی ہے جیسا کہ ان کی عبارت اور نقل کردہ حوالہ سے ثابت ہے' مانعین نے ذکر اور دعا۔ کے بلند آواز سے بدعت اور مکروہ ہونے کا ثبوت جن حوالوں سے دیا ہے مؤلف مذکور ان کو شیر مادر سمجھ کر ہڑپ کر گئے ہیں اور ڈکار تک نہیں لیا۔

(۲) حضرت مولانا عبدالحی صاحب لکھنویؒ نے اس حدیث سے جو کچھ ثابت کیا ہے وہ بالکل بجا ہے اور ہم نے بھی اس حدیث سے یہی کچھ ثابت کیا ہے مؤلف مذکور کا اخلاقی فریضہ تھا کہ وہ ہماری عبارت بھی پیش کرتے تاکہ قارئین کرامؒ کو معلوم ہوتا کہ ہم نے کیا کہا ہے؟ مگر ان کو صرف اپنی گروہ بندی اور اپنے ناخواندہ حواریوں کو اندھیرے میں رکھنے کی عادت ہے، جیسا کہ ان کی کتابوں اور ان کی عبارات سے بالکل عیاں ہے عیاں راچہ بیاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم مولانا عبدالحی لکھنویؒ کے فتاویٰ سے نقل کی ہوئی ایک عربی عبارت کا ترجمہ جو مؤلف مذکور نے کیا ہے یہاں عرض کر دیں حاصل کلام یہ ہے کہ ذکر بالجہر اگرچہ جائز ہے لیکن جہر مفرط ممنوع ہے اور ذکر بالسرّ غیر مفرط سے بھی افضل ہے جہر مفرط کے بہت سے مفاسد ہیں جن میں سے ایک سوتوں کو جگانا اور دوسرا نمازیوں کی توجہ مشغول کرنا جس کے سبب وہ سہو میں مبتلا ہوتے ہیں تیسرا خضوع اور خشوع

کا ترک کرنا وغیرہا (فتاویٰ عبدالحی ج ۲ ص۳۰) مولوی عبدالحی ذکر بالسرّ کے حامی ہیں اور اسی کو افضل قرار دیتے ہیں لیکن ان کو بھی تسلیم کرنا پڑا ہے کہ جس جہر پر نیند اور نماز میں خلل کے مفاسد مترتب ہوتے ہیں وہ جہر مفرط ہے اور جہر متوسط کے جواز میں کوئی کلام نہیں ہے (بلفظہٖ ذکر بالجہر ص۸۸)

الجواب: ہم نے حکم الذکر بالجہر میں تصریح کی ہے کہ اپنے مقام پر ذکر بالجہر جائز ہے اس کا کوئی منکر نہیں وہ یہ کہ کسی کی نماز، نیند، مطالعہ اور آرام وغیرہ میں خلل نہ پڑتا ہو اور یہی کچھ بقول مؤلف مذکور حضرت مولانا عبدالحیؒ فرماتے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ اہل بدعت حضرات رَل مِل کر ذکر میں جو جلیاں ڈالتے ہیں اور گلے پھاڑ پھاڑ کر لاوڈ اسپیکر پر جو راگیں نکالتے ہیں کہ نہ کوئی نماز پڑھ سکے نہ تلاوت کر سکے نہ مطالعہ کر سکے نہ سو سکے اس کا ان کے نزدیک کیا نام ہے؟ اور ان کی مساجد میں جب امام سلام پھیرتا ہے تو یہ لوگ نہ صرف یہ کہ جہر مفرط کا ارتکاب کرتے ہیں بلکہ مسجد کو سر پر اٹھا لیتے ہیں حالانکہ کئی نمازی جو بعد میں آکر ملتے ہیں وہ اپنی نمازیں پڑھ رہے ہوتے ہیں کیا اس چلّانے سے ان کی نمازوں میں خلل نہیں پڑتا؟ یا اس کا وہ کیا نام رکھتے ہیں؟ ؎

کس طرح فریاد کرتے ہیں بتادو قاعدہ
اے اسیرانِ ہوس تم تو گرفتاروں میں ہو

باب ششم

اثر عبداللہ بن مسعودؓ | ہم نے راہِ سنت ص۱۱۸ میں حضرت ابن مسعودؓ کی روایت نقل کی تھی کہ مسجد میں لوگوں کا حلقہ تھا، اور ایک شخص اُن سے سو سو مرتبہ تسبیح و تہلیل و تکبیر کہلواتا تھا حضرت ابن مسعودؓ کو اس کا علم ہوا تو انہوں نے ان لوگوں کی اس کارروائی کو بدعت قرار دیا اور ناراضگی کا اظہار فرمایا (محصلہ) اس پر مؤلف مذکور گرفت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ مانعین جہر اس روایت کو بطور ہتھیار استعمال کرتے ہیں لیکن اس کی سند میں عمر بن یحیٰی ہے جو متروک اور ضعیف ہے اور شعبہؒ سے متشابہ بالموضوعات احادیث روایت کرتا ہے (لسان المیزان ج ۴ ص۳۳۷) اور باوجود ضعیف ہونے کے یہ روایت اصول دین سے بھی متصادم ہے تمام محققین علماء کرام نے اسے رد کیا ہے چنانچہ علامہ آلوسیؒ لکھتے ہیں واقعات میں جو اثر ابن مسعودؓ ذکر کیا گیا ہے وہ آئمہ حدیث اور حفاظ کے نزدیک صحیح نہیں ہے اور برتقدیر صحت وہ ان آثار سے معارض ہے جن سے ثابت ہے کہ عبداللہ بن مسعودؓ خود بآواز بلند ذکر کیا کرتے تھے کیونکہ اس بات کو متعدد حفاظ حدیث نے ذکر کیا ہے یا پھر ان کا جہر سے منع کرنا جہر مفرط پر محمول ہے (روح المعانی ج ۱۶ ص۱۶۳) اور امام سیوطیؒ اس اثر کے بارے میں لکھتے ہیں برتقدیر صحت و ثبوت یہ اثر ان احادیث رسول سے معارض ہے جن میں ذکر بالجہر

کا ثبوت ہے اھ (الحاوی للفتاوی ج ۱ ص ۳۹۴) اور علامہ اسمٰعیل حقی حنفیؒ اس پر گفتگو کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ میں کہتا ہوں کہ شیخ سنبل خلوتی ؒ نے اپنے رسالہ میں اس اثر کے جواب میں فرمایا کہ یہ اثر حضرت ابن مسعودؓ پر کذب وافتراء ہے کیونکہ یہ اثر نصوص قرآنیہ' احادیث نبویہ اور افعال ملائکہ کے مخالف ہے الخ (روح البیان ج ۲ ص ۲۴۳) (محصلہ ذکر بالجہر ص ۱۵۵ تا ۱۵۹)

الجواب: مؤلف مذکور نے یہ جو لکھا ہے' ان کی کم فہمی اور جہالت کا نتیجہ ہے۔

اولاً" اس لیے کہ جو راوی انہوں نے بتایا ہے' وہ دارمی کا ہرگز نہیں ہے۔ دارمی کی سند یوں ہے اخبرنا الحکم بن المبارک انا عمرو بن یحیٰی قال سمعت ابی یحدّث عن ابیہ الخ اور جس راوی کی نشاندہی انہوں نے کی ہے' نہ تو اس کی اپنے باپ یحیٰی سے اور نہ اپنے دادا سے روایت ثابت ہے اور نہ الحکم بن المبارک کی کوئی روایت اس سے ثابت ہے۔ محض تُک بندی سے کچھ نہیں بنتا۔ یہاں صراحتاً" ٹھوس ثبوت درکار ہے۔ یہ راوی عمرو بن یحیٰی بن سعید ہے جس کی روایت اپنے باپ اور دادا سے ہے۔ (تہذیب ج ۸ ص ۱۱۸ وغیرہ) امام ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ امام ابن معینؒ ان کو لا بأس بہ اور امام دار قطنی ؒ ثقہ کہتے ہیں (تہذیب ج ۸ ص ۱۱۸) علاوہ ازیں ہمارے پاس مسند دارمی طبع کانپور ص ۳۸ اور مسند دارمی طبع دہلی کا اردو مترجم نسخہ بھی موجود ہے اور ان میں راوی کا نام عمرو بن یحیٰی لکھا ہے۔ بظاہر عربی نسخہ میں کتابت کی غلطی سے حرف واو چھوٹ گیا ہے اور یہی قرین قیاس ہے۔

ثانیاً" اس لیے کہ علامہ آلوسیؒ نے حضرت ابن مسعودؓ کی مسند دارمی کی روایت پر گرفت نہیں کی جیسا کہ مولف مذکور نے اپنی جہالت سے یہ سمجھ رکھا ہے۔ اگر ان کو مسند دارمی کی روایت کا رد کرنا منظور ہوتا تو وہ مسند دارمی کا نام لیتے کیونکہ وہ حدیث کی مشہور کتاب ہے۔

کی مشہور کتاب ہے علاوہ ازیں مسند دارمی کی روایت کے الفاظ جدا ہیں، اور واقعات کی روایت کے الفاظ بالکل جدا ہیں یہ دو الگ الگ روایتیں ہیں مسند دارمی کی روایت میں ہے کہ ایک شخص کچھ لوگوں کو تسبیح و تہلیل اور تکبیر پڑھواتا اور وہ پڑھتے جاتے اور واقعات کی روایت میں ہے کہ سب رل مل کر لا الٰہ الا اللہ پڑھتے تھے اور دارمی کی روایت میں ان لوگوں کو مسجد سے نکالنے کا بھی کوئی ذکر نہیں ہے اور واقعات کی روایات میں یہ ہے کہ ان کو مسجد سے نکالا گیا خود علامہ آلوسیؒ کے اپنے الفاظ یہ ہیں۔

وما ذکر فی الواقعات عن ابن مسعودؓ	کہ (کتاب) واقعات میں حضرت ابن مسعودؓ
من انہ رأی قوما یھللون برفع	سے جو یہ ذکر کیا گیا ہے کہ انہوں نے ایک
الصوت فی المسجد فقال ما اراکم	قوم کو بلند آواز سے مسجد میں لا الٰہ الا اللہ
الا مبتدعین حتی اخرجھم من	پڑھتے دیکھا تو فرمایا کہ میں نہیں بدعتی سمجھتا
المسجد لا یصح عند الحفاظ من	ہوں حتیٰ کہ انہوں نے ان کو مسجد سے نکال
الائمۃ المحدثین وعلیٰ فرض صحتہ	باہر کیا یہ آئمہ محدثین کے حفاظ کے نزدیک
ھو معارض بما یدل علیٰ ثبوت	صحیح نہیں ہے اور بر تقدیر صحت یہ اس سے
الجھر منہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ مما	معارض ہے جو ان سے ثبوت جہر میں وارد
رواہ غیر واحد من الحفاظ او	ہوئی ہے جس کو بہت سے حفاظ نے ان
محمول علی الجھر البالغ اھ	سے روایت کیا ہے یا انہی کی روایت جہر
(روح المعانی ج ۱۶ ص ۱۶۳)	مفرط پر محمول ہے

علامہ آلوسیؒ نے تین جواب دیئے ہیں پہلا جواب یہ دیا ہے کہ آئمہ حفاظ محدثین کے نزدیک یہ صحیح نہیں ہے مگر نہ تو انہوں نے عدم صحت کی کوئی معقول اور صریح وجہ بیان کی ہے اور نہ حفاظ محدثین کے نام ہی بتاتے ہیں ممکن ہے

یہ حفاظ محدثین امام خطیب بغدادیؒ اور امام ابن الجوزیؒ جیسے متشدد حضرات ہوں جو صحیح اور حسن قسم کی حدیثوں کو بھی موضوع قرار دے لیا کرتے ہیں بخلاف اس کے امام بزازی الحنفیؒ اور علامہ شامیؒ وقد صح عن ابن مسعودؓ الخ (فتاوٰی بزازیہ علی ہامش الہندیہ ج ۴ ص ۳۷۵ وشامی ج ۵ ص ۳۵۰) سے اس واقع کو صحیح قرار دیتے ہیں اور بریلوی حضرات کے محقق اور وسیع النظر عالم مولوی عبد السمیع صاحب بھی اس واقعہ کو علامہ حمویؒ کے حوالہ سے وقد صح عن ابن مسعودؓ الخ کے الفاظ سے نقل کرتے ہیں (انوار الساطعہ ص ۳۸) اور قاعدہ یہ ہے کہ المثبت اولیٰ من النافی اور علامہ آلوسیؒ حضرت ابن مسعودؓ سے ذکر بالجہر کی جن روایتوں کا حوالہ دیتے ہیں وہ حفاظ حدیث کے حوالہ سے مطلوب ہیں کہ وہ کونسی روایات ہیں اور کہاں ہیں؟ امام سیوطیؒ نے الحاوی للفتاوی ج ۱ ص ۳۹۴ میں امام احمدؒ بن حنبلؒ کی کتاب الزہد کے حوالہ سے حضرت ابو وائل سے یہ روایت نقل کی ہے کہ لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ حضرت ابن مسعودؓ ذکر سے منع کرتے تھے اور میں عبد اللہ بن مسعودؓ کی کسی مجلس میں نہیں بیٹھا مگر ذکر اللہ فیہ وہ اس میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے تھے لیکن اس سے استدلال صحیح نہیں ہے کیونکہ اس روایت میں جہر کا کوئی لفظ موجود نہیں ہے اور نفس ذکر کا کوئی منکر نہیں مؤلف مذکور نے اس کا ترجمہ کرتے ہوئے بین القوسین (بآواز بلند) اپنی طرف سے لکھا ہے (ملاحظہ ہو ذکر بالجہر ص ۱۵۸)

الغرض حضرت ابن مسعودؓ کی اس روایت کا ان کی اپنی یا کسی اور صحابی کی یا کسی مرفوع اور صریح حدیث سے قطعاً کوئی تعارض نہیں ہے جیسا کہ امام سیوطیؒ نے لکھا ہے اور نہ یہ روایت کذب و افتراء ہے جیسا کہ علامہ حنفیؒ نے لکھا ہے اور نہ حدیث کی تصحیح یا تضعیف ان کا مقام ہی ہے بلکہ یہ روایت وقد صح کا مصداق ہے اور یہ بالکل صحیح ہے اور تیسری بات علامہ آلوسیؒ نے یہ لکھی ہے کہ اس سے

جہر مفرط مراد ہے ہمارا بھی اس پر صاد ہے اور ہم نے خود علامہ آلوسیؒ سے جہر اور نہر کا باحوالہ معنیٰ عرض کر دیا ہے اور جس جہر سے کسی کی نیند یا نماز یا مطالعہ یا آرام وغیرہ میں خلل آتا ہو وہی ممنوع ہے اور خود اہل انصاف اس امر کا مشاہدہ کریں کہ آج کل اہل بدعت جس انداز سے صلوٰۃ وسلام پڑھتے ہیں یا ذکر و تلاوت کرتے ہیں آیا وہ جہر مفرط کی مد میں آتا ہے یا نہیں؟ اور آیا اس سے لوگوں کی نمازوں اور نیند اور آرام وغیرہ میں خلل پڑتا ہے یا نہیں پڑتا؟ انصاف خود قارئین کرام فرمائیں ہمیں اس میں مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے ؎

پُوچھ اس سے کہ مقبول ہے فطرت کی گواہی
تو صاحبِ منزل ہے کہ بھٹکا ہوا راہی

باب ہفتم

اپنے گھر کی بے خبری مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم مؤلف مذکور کو جس مدرسہ میں وہ مدرس ہیں' اس کے بانی اور صدر مفتی صاحب کا فتوٰی بھی سنا دیں تا کہ اگر ان کو وہابیوں کی بات سمجھ نہیں آتی تو شاید اپنے گھر کی اکسیر ہی سود مند ثابت ہو۔

سوال : حضرت مولانا مفتی محمد حسین نعیمی صاحب! السلام علیکم

گزارش ہے قرآن وسنت کی روشنی میں ارشاد فرمائیں کہ پنج وقت نماز کے لیے جو اذانیں دی جاتی ہیں' ان سے پہلے رسول اللہ ﷺ پر درود وصلوۃ باآواز بلند بھیجنا مسنون ومشروع ہے جیسا کہ ہمارے ہاں معمول بنتا جا رہا ہے۔ نماز فجر سے پہلے ہمارے محلہ کی مسجد میں تین یا ساڑھے تین بجے ہی لاؤڈ اسپیکر پر صوفیاء کا کلام یا کوئی اور کلام سنانا شروع کر دیا جاتا ہے۔ کبھی کبھی درود وسلام بھی سنایا جاتا ہے۔ کیا محلہ والوں کو تین یا ساڑھے تین بجے ہی جگا دینا اسلامی طریقہ ہے؟ صحیح فتوٰی دے کر عند اللہ ماجور ہوں۔

(السائل محمد حنیف' باغبان پورہ' جی ٹی روڈ ۲۴۵ لاہور)

الجواب : ھو الموفق للصّواب - درود شریف پڑھنا مسلمان کے لیے ذریعہ نجات اور وسیلہ شفاعت ہے۔ قرآن کریم میں واضح طور پر ایمان والوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ محبت اور عظمت رسولؐ کے لیے درود شریف پڑھا کریں۔ نماز کے اندر بھی درود شریف پڑھنے کا حکم ہے اس لیے کوئی صحیح العقیدہ مسلمان درود شریف سے ہرگز گریز نہیں کر سکتا اور اگر کوئی ایسا کرے تو یہ اس کی بد نصیبی ہوگی۔ اذان کے کلمات مقرر ہیں' اس میں کمی بیشی کرنا یا ان کے آگے پیچھے درود شریف یا قرآن کریم کی آیات بلا فصل ملانا بدعت اور عبادتِ الٰہی میں خلل ڈالنے کے مترادف ہے۔ اذان کے ساتھ اول درود شریف کو لازم قرار دینا یا اہل سنت کا شعار بنانا بھی بدعت اور عبادت معہودہ میں تحریف کرنے کی کوشش ہے۔ بہتر یہ ہے کہ درود شریف پڑھنے کی سعادت اگر حاصل کرنی ہے تو اذان کے علیحدہ پڑھی جائے کم از کم پانچ منٹ پہلے پڑھ لی جائے' درمیان میں وقفہ دے کر اذان کہیں۔

اس سے بھی بہتر یہ ہے کہ اذان کے بعد دعا پڑھ کر درود شریف پڑھیں۔ (صحیح مسلم ج ۱ ص ۱۶۶ کی حدیث میں آتا ہے اذا سمعتم المؤذن فقولوا مثل ما یقول ثم صلّوا علیّ فانه من صلّی علیّ صلوة صلی الله علیه بها عشرا ثم سلوا الله لی الوسیلة الحدیث اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اذان کے بعد پہلے درود شریف پڑھا جائے پھر وسیلہ والی دعا پڑھی جائے۔ محصلہ۔ صفدر) جب لوگ سوئے ہوئے ہوں یا کسی کام میں مشغول ہوں' نماز یا جماعت سے پہلے قرآن کریم یا درود شریف یا کوئی وظیفہ یا صوفیاء کرام کا کلام بلند آواز سے پڑھنا سنت کے خلاف اور اہل اسلام کو پریشان کرنے' ان کو بلا وجہ تنگ کرنے کے گناہ کا ارتکاب ہے۔ بالخصوص فجر سے پہلے لاؤڈ اسپیکر پر صوفیائے کرام کا کلام پڑھنا غیر مستحسن اور دوسروں کو تکلیف دینے کے مترادف ہے۔ فجر کے وقت سوائے دو سنت کے نوافل پڑھنے کا حکم بھی نہیں ہے۔ حضور ﷺ نمازیوں کی دشواری کے پیش نظر بعض اوقات نماز اور قراءت میں تخفیف کر دیا کرتے تھے۔ امام وخطیب کو ایسا رویہ اختیار نہیں کرنا چاہئے جس سے اہل محلہ تنگ ہوں جبکہ اس کا عمل سنت بھی نہ ہو مستحب بھی نہ ہو۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب (مفتی) محمد حسین نعیمی جامعہ نعیمیہ لاہور

اس فتویٰ کو مؤلف مذکور بار بار پڑھیں اور انصاف سے کہیں کہ مذکور طریق سے درود شریف پڑھنے سے کیا دیوبندی اور وہابی ہی منع کرتے ہیں یا بریلوی مفتی صاحبان بھی اور خصوصاً" آپ کے مدرسہ کے مہتمم اور صدر مفتی بھی جن کے زیر سایہ آپ مدرسہ میں ملازم ہیں' منع کرتے ہیں اور عوام سے دریافت کر لیں کہ اس شور وغل سے لوگوں کو تکلیف ہوتی ہے یا نہیں؟

دار العلوم حزب الاحناف لاہور کا فتویٰ: فجر ہونے سے پہلے لاؤڈ اسپیکر پر بلند آواز سے درود شریف پڑھنا جائز نہیں۔ کیونکہ کاروباری آدمی سوئے ہوئے ہوتے ہیں۔ ان کے آرام میں خلل واقع ہوتا ہے۔ در المختار میں ہے فی حاشیة الحموی عن الامام الشعرانی الخ حموی میں امام شعرانیؒ نے فرمایا ہے مسجدوں میں یا مسجدوں کے علاوہ جماعت کا ذکر کرنا مستحب ہے۔ اس میں سلف وخلف کا اجماع ہے اگر ان کا ذکر جہر سونے والے پر اور نماز پڑھنے یا قرآن پڑھنے والے پر مشوش ہو تو جائز نہیں اور اعلیٰ حضرت نے فتاوی رضویہ جلد سوم میں بھی

قریب قریب ایسا ہی فرمایا ہے لیکن انہوں نے مریض کا ذکر بھی فرمایا ہے کہ بلند آواز سے ذکر کرنے سے اگر مریض کے آرام میں خلل آتا ہے تو ذکر جہر ممنوع ہے لہذا جب فجر طلوع ہو جائے تب لاؤڈ اسپیکر پر درود شریف بلند آواز سے پڑھ سکتے ہیں (کیا اس وقت قرآن پڑھنے والوں اور نماز پڑھنے والوں اور مریضوں کو تکلیف نہیں ہوتی؟ صفدر) لیکن فجر سے پہلے نہ پڑھیں۔ مورخہ ۲۲۔ اکتوبر ۱۹۷۸ء (ماخوذ از اشتہار شائع کردہ مرکز سواد اعظم اہل السنت والجماعت آستانہ عالیہ چشتیہ صابریہ دار الحق ٹاؤن شپ سکیم لاہور) اس حوالہ میں جس فتویٰ کی طرف اشارہ ہے' وہ درج ذیل ہے:

الفتاوی الرضویہ: بریلوی حضرات کے اعلیٰ حضرت لکھتے ہیں کہ "درود شریف خواہ کوئی وظیفہ باآواز نہ پڑھا جائے جب کہ اس کے باعث کسی نمازی یا سوتے یا مریض کی ایذا ہو یا ریا آنے کا اندیشہ اور اگر کوئی محذور موجود نہ ہو نہ مظنون تو عند التحقیق کوئی حرج نہیں تاہم اخفاء افضل ہے لما فی الحدیث خیر الذکر الخفی واللہ سبحانہ وتعالی اعلم" (العطایا النبویہ فی الفتاوی الرضویہ ج ۳ ص ۱۰۶) مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم الفتاوی الرضویہ کے ایک دو حوالے اور بھی عرض کر دیں تا کہ بات بھی خوب روشن ہو جائے اور فریق مخالف پر اتمام حجت بھی ہو جائے۔

مسئلہ: از الہٰ آباد مسجد صدر مرسلہ حافظ عبد الحمید صاحب فتح پوری ۲ جمادی الاولی ۱۳۳۱ھ

اگر کوئی مسجد میں باآواز بلند درود ووظائف خواہ تلاوت کر رہا ہو' اس سے علیحدہ ہو کر نماز پڑھنے میں بھی آواز کانوں میں پہنچتی ہے لوگ بھول جاتے ہیں۔ خیال بھک جاتا ہے ایسے موقع پر ذکر بالجہر وتلاوت کرنے والے کو منع کرنا جائز ہے یا نہیں یعنی آہستہ پڑھنے کو کہنا بالجہر سے منع کرنا اگر نہ مانے تو کہاں تک ممانعت کرنا جائز ہے' اس کے متعلق کیا فرماتے ہیں علمائے دین۔

الجواب: بیشک ایسی صورت میں اسے جہر سے منع کرنا جائز ہی نہیں بلکہ واجب ہے کہ نہی عن المنکر ہے اور کہاں تک کا جواب یہ کہ تاحد قدرت جس کا بیان اس ارشاد اقدس حضور سید عالم ﷺ میں ہے من رأی منکم منکرا فلیغیرہ

بیده فان لم یستطع فبلسانه فان لم یستطع فبقلبه وذلک اضعف الایمان جو تم میں کوئی ناجائز بات دیکھے' اس پر لازم ہے کہ اپنے ہاتھ سے اسے مٹا دے' بند کر دے اور اس کی طاقت نہ پائے تو زبان سے منع کرے اور اگر اس کی بھی قدرت نہ ہو تو دل سے اسے برا جانے اور یہ سب میں کمتر درجہ ایمان کا ہے اور جہاں لوگ اپنے کاموں میں مشغول ہوں اور قرآن عظیم کے استماع کے لیے کوئی فارغ نہ ہو' وہاں جہراً تلاوت کرنے والے پر اس صورت میں دوہرا وبال ہے۔ ایک تو وہی خلل اندازی نماز وغیرہ کہ ذکر جہر میں تھا۔ دوسرے قرآن عظیم کو بے حرمتی کے لیے پیش کرنا۔ در مختار (بلکہ رد المحتار ج ۱ ص ۵۰۹۔ صفدر) فی الفتح عن الخلاصة رجل یکتب الفقه وبجنبه رجل یقرأ القرآن فلا یمکن استماع القرآن (ولا یمکن له استماع القرآن) فالاثم علی القارئ وعلی هذا لو قرأ علی السطح والناس نیام یأثم اھ ای لانه یکون سببا لاعراضهم عن استماعه او لانه یؤذیهم بایقاظهم اسی میں غنیة سے ہے یجب علی القارئ احترامه بان لا یقرأه فی الاسواق ومواضع الاشتغال فاذا قرأه فیها کان هو المضیع لحرمته فیکون الاثم علیه دون اهل الاشتغال دفعاً للحرج واللہ تعالیٰ اعلم (یعنی فتح القدیر ج ۱ ص ۲۴۲ میں خلاصہ ج ۱ ص ۱۱۳ سے نقل کیا ہے کہ ایک شخص فقہ (کے مسائل) لکھتا ہے اور اس کے پہلو میں کوئی شخص (بلند آواز سے) قرآن کریم پڑھتا ہے اور مصروف کے لیے قرآن کریم سننا ممکن نہیں تو گناہ پڑھنے والے پر ہے اور اسی طرح اگر کوئی شخص مکان کی چھت پر پڑھتا ہے اور لوگ سوئے ہوئے ہیں تو پڑھنے والا گنہگار ہے۔ اھ اس لیے کہ اس کا پڑھنا لوگوں کے سننے سے اعراض کا سبب ہے یا اس لیے کہ وہ ان کو بیدار کرنے کی اذیت دے رہا ہے اور اسی میں غنیة (المستملی ص ۴۶۴) سے ہے پڑھنے والے پر قرآن کریم کا احترام واجب ہے بایں طور کہ اس کو وہ بازاروں میں نہ پڑھے اور لوگوں کی مصروفیت کی جگہ نہ پڑھے۔ اگر پڑھا تو پڑھنے والا ہی اس کے احترام کو ضائع کرنے والا ہوگا اور وہی گنہگار ہوگا نہ کہ کام میں مصروف لوگ۔ کیونکہ ان سے حرج مرفوع ہے۔ صفدر) (الفتاوی الرضویہ جلد سوم ص ۶۱۹)

مسئلہ : کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ ایک یا

زیادہ شخص نماز پڑھ رہے ہیں یا بعد جماعت نماز پڑھنے آئے ہیں اور ایک یا کئی لوگ بآواز بلند قرآن یا وظیفہ یعنی کوئی قرآن کوئی وظیفہ پڑھ رہے ہیں یہاں تک کہ مسجد بھی گونج رہی ہے تو اس حالت میں کیا حکم ہونا چاہئے کیونکہ بعض دفعہ آدمی کا خیال بدل جاتا ہے اور نماز بھول جاتا ہے۔

الجواب: جہاں کوئی نماز پڑھتا ہو یا سوتا ہو کہ بآواز پڑھنے سے اس کی نماز یا نیند میں خلل آئے گا وہاں قرآن مجید ووظیفہ ایسی آواز سے پڑھنا منع ہے۔ مسجد میں جب اکیلا تھا اور بآواز پڑھ رہا تھا جس وقت کوئی شخص نماز کے لیے آئے' فوراً آہستہ ہو جائے واللہ اعلم (الفتاوی الرضویہ ج ۳ ص ۶۱۹)

مؤلف مذکور اور ان کے حواریوں کو اپنے اعلیٰ حضرت کی یہ عبارتیں غور سے اور بار بار پڑھنی چاہئیں اور پھر انصاف سے کہیں کہ کیا ایسے مواقع پر ذکر بالجہر سے منع کرنے میں ہم ہی گنہگار اور ظالم ہیں (جیسا کہ انہوں نے ذکر بالجہر میں لکھا ہے) یا اس میں آپ کے خان صاحب بھی ہمارے ساتھ برابر کے حصہ دار ہیں؟ اور کیا معاذ اللہ تعالیٰ بقول مؤلف مذکور کے ایسے مواقع پر ذکر بالجہر اور جہراً درود شریف پڑھنے سے منع کرنے میں آنحضرت ﷺ کی ذات گرامی سے عناد کا خوردہ اور چورن صرف ہمارے لیے مخصوص ہے یا آپ کے اعلیٰ حضرت کو بھی اس سے حصہ رسد کچھ ملے گا؟ (مؤلف مذکور لکھتے ہیں کہ بلکہ اصل جھگڑا تو حضور کی ذات کا ہے اور عناد ان کے نام سے ہے (العیاذ باللہ تعالیٰ۔ صفدر) انہیں کسی جگہ حضور کا نام سننا گوارا نہیں ہوتا (لعنۃ اللہ علی الکاذبین۔ صفدر) اور ہمارا اس نام کے بغیر گزارا نہیں ہوتا۔ انتھی بلفظہ (ذکر بالجہر ص ۲۴۵) یہ تو ہر سمجھ دار آدمی جانتا ہے کہ آپ لوگوں کا گزارا کس چیز پر ہوتا ہے؟ ہم اس غیر ضروری بحث میں نہیں پڑتے لیکن یہ کہنے میں بالکل حق بجانب ہیں کہ جن مواقع پر درود شریف اور تلاوت قرآن کریم اور وظائف وغیرہ بلند آواز کے ساتھ پڑھنے سے ہم منع کرتے ہیں' وہاں آپ کے اعلیٰ حضرت بھی منع ہی کرتے ہیں۔ پھر یہ بات انصاف ودیانت سے بالکل بعید ہے کہ ہم معاذ اللہ تعالیٰ ظالم اور معاند رسول ہوں (ﷺ) اور آپ کے اعلیٰ حضرت اس سے بالکل کورے نکل جائیں جب کہ وہ فرماتے ہیں اور مسلمان پر بد گمانی خود حرام ہے جب تک ثبوت شرعی نہ ہو۔ (فتاویٰ رضویہ ج ۳ ص ۲۰۸)

دردمندانہ اپیل: اگر مؤلف مذکور اور ان کے حواری ہمارے پیش کردہ حوالوں کے پیش نظر ذکر اور درود شریف کی آڑ لے کر عوام الناس کی نمازوں، نیند اور آرام وغیرہ میں خلل ڈالنے اور مریضوں کو ستانے اور تنگ کرنے سے باز نہیں آتے تو اپنے اعلیٰ حضرت ہی کے حوالوں پر عمل کریں، جب کہ خان صاحب کی وصیت بھی ہے کہ اور حتی الامکان اتباع شریعت نہ چھوڑو اور میرا دین ومذہب جو میری کتب سے ظاہر ہے، اس پر مضبوطی سے قائم رہنا ہر فرض سے اہم فرض ہے۔ اللہ توفیق دے بلفظہ (وصایا شریف ص ۸ طبع لاہور) اور نیز لکھتے ہیں جو میرے عقائد ہیں، وہ میری کتابوں میں لکھے ہیں، وہ کتابیں چھپ کر شائع ہو چکی ہیں اھ (ملفوظات حصہ اول ص ۴۵ طبع کراچی) ہماری بھی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسے مسائل پر عمل کرنے کی خان صاحب کے اتباع کو توفیق نصیب فرمائے تا کہ عوام الناس کو سکھ اور چین حاصل ہو۔ آمین ثم آمین

قارئین کرام! جہاں ذکر بالجہر شرعاً ثابت نہیں، وہاں ذکر بالجہر کا حرام، بدعت اور ممنوع ہونا اور اس کے صریح دلائل اصل کتاب حکم الذکر بالجہر میں ملاحظہ فرمائیں اور فریق مخالف کے مسلم بزرگوں کے حوالے اسی زیر نظر رسالہ میں آپ ملاحظہ کر چکے ہیں مثلاً ان کے اعلیٰ حضرت کے فتویٰ کی رو سے بھی جو ذکر بالجہر لوگوں کی نماز اور نیند وغیرہ میں خلل انداز ہو، اس کا منع کرنا واجب اور نہی عن المنکر کی مد میں شامل ہے۔ اگر ایسی تصریحات کے ہوتے ہوئے بھی کوئی شخص ایسے مقامات پر ذکر بالجہر اور بلند آواز سے درود شریف اور تلاوت قرآن کریم سے باز نہیں آتا تو عوام خود فیصلہ کر سکتے ہیں کہ ایسا شخص محض ضد اور عناد سے ازروئے شرارت ایسا کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ تمام مسلمانوں کو توحید وسنت پر قائم رکھے اور شرک وبدعت اور ممنوع کاموں سے محفوظ رکھے اور قرآن کریم اور صحیح احادیث اور حضرات فقہاء کرام کے واضح احکام پر چلنے کی توفیق مرحمت فرمائے۔ آمین ثم آمین

وصلی اللہ تعالی علی محمد وعلی آلہ واصحابہ وازواجہ وجمیع من تبعہ الی قیام الساعۃ وبارک وسلم

۴ ربیع الاول ۱۴۰۱ھ — احقر ابو الزاہد محمد سرفراز، خطیب جامع مسجد گکھڑ
۱۰ جنوری ۱۹۸۱ء — وصدر مدرس مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ